

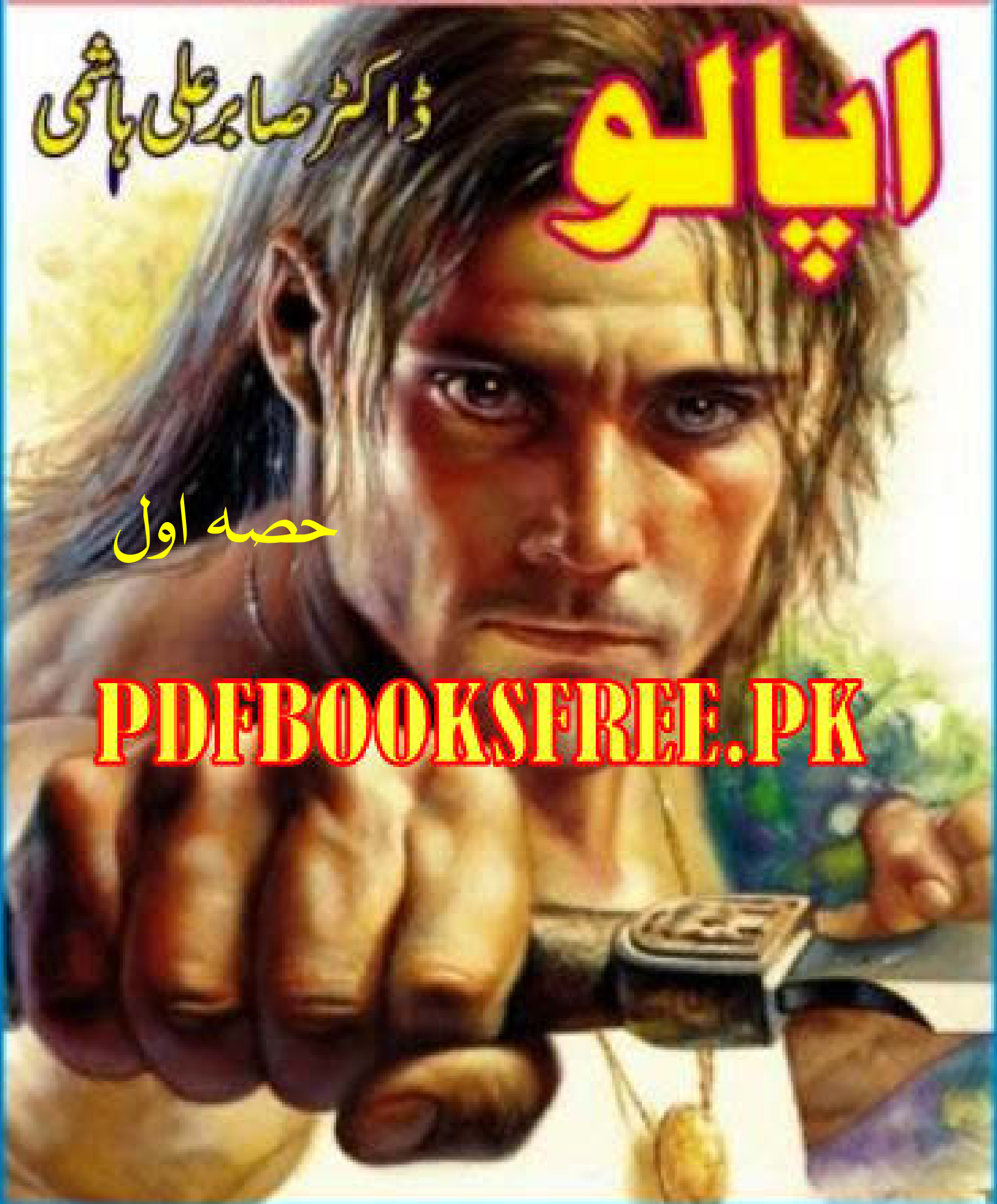
ایک نوجوان کی داستان جسے اپنی تلاش تھی اور دنیا کے سرکردہ لوگ اس کی تلاش میں تھے۔  
وہ خود کیا تھا..... خوبصورتی کا پیکر..... یا..... بھائی کی علامت

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

اپلو

حصہ اول

PDFBOOKSFREE.PK



اپنی تلاش میں سرگرداں تباہی و بربادی اور حسن و عشق کے دیوتا کی داستان عجیب

# اپالو

(پہلا حصہ)

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی



علی میاں پبلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: 042-37247414

**PDFBOOKSFREE.PK**

## ڈاکٹر صابر علی ہاشمی تفحص: صابر

پیدائش: دسمبر 1967ء ضلع مظفر گڑھ پنجاب

تعلیم: بی ایس سی ڈی۔ ایچ۔ ایم۔ ایس ڈی۔ ٹی۔ ایس (آرٹھوڈونٹکس)



ڈاکٹر صابر علی ہاشمی بنیادی طور پر نثر نگار ہیں، انہوں نے لکھنے کا آغاز اسکول کے زمانے سے ہی کر دیا تھا۔ ابتداء میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں جو بچوں کے مختلف رسائل میں شائع ہوئیں۔

کالج میں پہنچنے سے قبل ہی کراچی کے مختلف ڈائجسٹوں میں ان کی کہانیاں شائع ہونے لگیں، ان کے والد کا تعلق بھی صحافت سے تھا۔ جو اپنے وقت کے مقبول اخبار روز نامہ مساوات ہفت روزہ صحافت روز نامہ تلوار وغیرہ سے منسلک رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو رہنمائی اپنے گھر سے ہی ملی۔ وہ طبعاً ادب کا شوق رکھنے کے ساتھ ساتھ تراجم بھی کرنے لگے۔

ایک معروف ادارے کے فلمی رسالے سے وابستہ ہو کر صحافتی زندگی کی ابتدا کی، فطری طور پر شاعر ہونے کی وجہ سے اکثر ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے اور یوں اچھا خاصا کلام جمع ہو گیا اور ”گوشہ قلب“ وجود میں آیا۔ کئی طویل کہانیاں تخلیق کر چکے ہیں، جن میں سے ”سوچ نگر کا مسافر“ اور ”تیا گی“ کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کئی ناول کتابی شکل میں آچکے ہیں، کچھ تیاری کے مراحل میں ہیں۔ نوجوانوں کے لیے نفسیاتی مسائل اور ان کی رہنمائی پر بھی چند کتب تحریر کر چکے ہیں۔ اردو الفاظ کی تحقیق سے متعلق ”لفظوں کا دلچسپ سفر“ کتابی شکل میں موجود ہے اور ”نوبل انعام یافتگان..... ادیب و سائنس دان“ اور ان کے ادبی افسانوں کا مجموعہ ”آگینے“ کے نام سے بہت جلد شائع ہو رہے ہیں۔

کئی ملکی اور بین الاقوامی رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے ہیں، جن میں پندرہ روزہ اخبار اقوام، پندرہ روزہ شرف، روز نامہ امت، ماہنامہ رابطہ، ماہنامہ عمران ڈائجسٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ان دنوں ایک معروف اشاعتی ادارے سے منسلک ہیں۔

انہوں نے خود بھی ادبی ہفت روزہ ”قلکار“ ماہنامہ ”بچے“ پندرہ روزہ ”شائنگ اسٹار“ کا اجرا کیا اور کامیابی حاصل کی۔ شعبہ درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ آج کل بچوں کے لیے تدریسی کتب پر کام کر رہے ہیں۔ جن میں اردو اور اسلامیات شامل ہے۔

ان کی تحریروں اور کلام میں جہاں رومان ہے، وہیں معاشی اور معاشرتی زندگی کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ ان کے ذہن اور وجود میں ایک بے چینی ہے، جس کا اظہار وہ اپنی تحریروں کے ذریعے کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا کافی وقت معروف ادباء و شعراء کی محفلوں میں گزارا ہے اور اکثر اپنا وقت مطالعے میں گزارتے ہیں، وہ کہتے ہیں: ”طلسم ہوش رُبا اور گلستاں و بوستاں کے مطالعے کے بعد مجھ میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی تھی۔“ یہ حقیقت ہے اور اس کا اظہار ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی حساس اور فکر انگیز طبیعت کے مالک ہیں، اس کا اندازہ ان کے اشعار سے بھی ہوتا ہے۔

کچھ لوگ زمانے میں ایسے بھی تو ہوتے ہیں  
محفل میں جو ہنستے ہیں، تنہائی میں روتے ہیں  
یہ درد کے فکڑے ہیں اشعار نہیں صابر  
ہم کانچ کے دھاگوں میں زخموں کو پروتے ہیں



اس روز.....

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا، نرم اور گدیلے بستر پر پڑا پایا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا اور سفید دیواریں آرائش و زیبائش کی ہر چیز سے بے نیاز تھیں۔ صرف ایک خوبصورت سا کیلنڈر اور ایک دیوار گیر گھڑی جو غالباً بجلی سے چلتی ہوگی، میرے سامنے لٹکی ہوئی تھی۔ اور ہاں! چار ٹکڑوں والا ایک پیسہ دار اسکرین میرے بستر کے قریب موجود تھا۔

آنکھوں پر زور پڑا تو مجھے اپنے سر میں دھمک دھمک ہوتی محسوس ہوئی۔ اس دھمک نے بڑی تیزی سے درد کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے بے تاب ہو کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لینا چاہا تو مجھے پتا چلا کہ میرے بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دایاں ہاتھ سر پر پہنچا تو پتا چلا کہ سربھی پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ میرے منہ سے ایک کراہ نکل گئی اور تکلیف کی شدت نے مجھے آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں تو میں پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اپنے بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر ایک شخص کو بیٹھے دیکھا۔ وہ کسی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے قریب کھڑے ہوئے دوسرے آدمی کے جسم پر سفید اپرن تھی اور وہ اپنے گلے میں کوئی آلہ ڈالے ہوئے تھا۔ وہ دونوں بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور ان کی نظریں میری طرف نہیں تھیں۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور جلدی سے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اب میں اپنے ذہن پر زور دے کر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسی وردی میں نے کب اور کہاں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ سفید اپرن والے شخص کے گلے میں پڑا ہوا آلہ بھی مجھے جانی پہچانی سی چیز محسوس ہوتی تھی لیکن مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔

”..... اب تک ہوش آ جانا چاہیے تھا۔“ ایک آواز میرے کانوں میں آئی۔ ”اگر اگلے چند منٹ میں بھی ہوش نہیں آیا تو مجھے ایک اور انجکشن لگانا پڑے گا۔“

”تو کیا مجھے زیادہ دیر تک انتظار کرنا پڑے گا۔؟“ دوسری آواز قدرے بھاری تھی۔

”نہیں انسپکٹر صاحب! بس چند منٹ اور لگیں گے۔“ انسپکٹر صاحب! انسپکٹر صاحب! میرا ذہن تکرار کرنے لگا۔ میں ان الفاظ کے معنی تلاش کرنا چاہتا تھا لیکن اس کوشش کے باعث میرے سر کے کسی حصے میں درد کی ایک ٹیس ابھری اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت وردی والے کی نظریں میری ہی طرف تھیں۔

”خدا کا شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا۔“ اپرن والا بول پڑا۔ ”میں..... میں کہاں ہوں؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”آپ ہسپتال میں ہیں۔ میں ڈاکٹر جمالی ہوں اور آپ.....“ اپرن والے نے دردی والے کی طرف اشارہ کیا۔ ”انسپکٹر جوگیندر ہیں۔“

”انسپکٹر۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا اور فوراً ہی میرے ذہن نے ایک اور لفظ کا اضافہ کر دیا۔ ”پولیس انسپکٹر؟“



”جی ہاں۔“ جوگیندر بولا: ”میں آپ کا بیان لینا چاہتا ہوں۔“

”بیان؟ کیسا بیان؟“ میرے ذہن نے پھر کام کرنے کی کوشش کی لیکن بالکل اسی انداز میں جیسے برسوں کی زنگ آلود مشین، صفائی کے بعد انک انک کر چلنا شروع کرے۔

”حادثے کے بارے میں!“ انسپکٹر میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”کیسا حادثہ؟“ یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ بے اختیار سر پر پہنچ گیا تھا۔

انسپکٹر جوگیندر نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر قدرے تیز لہجے میں بولا: ”کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ ایک کار کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔!“ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور ذہن پر زور دیا لیکن کچھ یاد نہیں آیا۔ ذہن کے پردے پر کچھ دھندلے دھندلے سے نقوش ابھرے لیکن میں ان نقوش کو پہچاننے سے قاصر رہا۔

”مجھے کچھ یاد نہیں، مجھے کچھ یاد نہیں۔“ میں بڑبڑایا۔

ڈاکٹر جمالی مجھے پر تشویش نظروں سے دیکھنے لگا۔ انسپکٹر جوگیندر نے اس پر ایک اپنی سی نظر ڈالی اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر

بولا۔

”میں آپ کو یاد دلانے کی کوشش کروں گا۔ آپ سڑک پار کرنے کے لیے فٹ پاتھ سے اترے ہی تھے کہ کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک کار تیزی سے حرکت میں آئی آپ اس وقت سڑک کے وسط تک پہنچے تھے کہ کار نے آپ کو ٹکرایا۔ یعنی شاہدوں کا بیان ہے کہ آپ اپنی حاضر دماغی اور پھرتی کی وجہ سے بچ گئے تھے۔ ورنہ کار نے تو آپ کو کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی آپ برقی سرعت کے ساتھ کار کی زد سے نکلے تھے لیکن پھر بھی کار کی سائڈ آپ سے ٹکرائی گئی تھی اور آپ اچھل کر فٹ پاتھ کے قریب جا گرے تھے۔ آپ کا سرفٹ پاتھ کے کنارے سے ٹکرایا تھا اور بایاں ہاتھ ایک لیپ پوسٹ سے ٹکرا کر مجروح ہوا تھا۔ کیا اب آپ کو کچھ یاد آیا؟“

میں نے سر کوئی میں جنبش دی۔ یہ میری ایک بے ساختہ حرکت تھی جس کی سزا مجھے فوراً ہی مل گئی۔ درد کی ٹپیں میرے سر کے کسی حصے میں ابھریں اور سارے جسم میں پھیلتی چلی گئیں۔ میرے منہ سے کراہ نکلتے نکلتے رہ گئی میں نے سختی سے دانت پر دانت جمائے تھے۔ انسپکٹر نے چند لمحوں کے وقف کیا اور غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا: ”یعنی شاہدوں نے دھیان نہیں دیا ورنہ یہ آسانی کار کا نمبر نوٹ کر سکتے تھے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ جعلی نمبر پلیٹ استعمال کی گئی ہو کیونکہ ایسے معاملات میں عموماً مختاطر ہا جاتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حادثہ نہیں تھا۔ دیدہ و دانستہ آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کیا آپ اپنے کسی جانی دشمن کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟“

دشمن۔!

میرے ذہن پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ ذہن کے انجانے تار جھنجھٹانے لگے اور دماغ کے کسی تاریک ترین گوشے سے ایک تصویر ابھر کر نظروں کے سامنے آگئی۔ وہ ایک بوڑھے کا بھیا تک سا چہرہ تھا۔ بد صورت اور بھونڈا۔ وہ داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا اور

اس پر پڑی ہوئی لا تعداد جھریاں، بیتے ہوئے بے شمار سالوں کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں بڑا بھیاں تک تاثر تھا۔ روشن اور چمک دار جیسے دودھ کھتے ہوئے الاؤ! میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑتی چلی گئی۔ ان آنکھوں میں نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس سمندر کی کوہ پیکر موجیں میرے وجود کو جیسے بہا لے جانا چاہتی تھیں۔ میرے وجود کے پرچے اڑا دینا چاہتی تھیں۔

ایک بیک میرے دماغ میں درد کی لہریں اٹھیں اور ان لہروں نے تصور کے پردے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ منحوس چہرہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے درد سے بے کل ہو کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ انسپکٹر کی بھاری آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ اپنا سوال دہرا رہا تھا۔

”کیا آپ اپنے کسی ایسے دشمن کو نہیں جانتے جو آپ کی موت کا خواہش مند ہو؟“

میں نے آنکھیں کھول کر بے بسی سے انسپکٹر کی طرف دیکھا اور پھر مردہ سی آواز میں کہا: ”نہیں“

انسپکٹر کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات تھے۔ وہ قدرے توقف سے بولا: ”شاید آپ کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ خیر!..... آپ اپنا نام اور پتا تو بتائیے!“ انسپکٹر نے اپنی جیب سے نوٹ بک اور قلم نکال لیا۔

”نام؟..... پتا؟“ میرے منہ سے نکلا۔

”جی!“ انسپکٹر نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر چہچہتے ہوئے لہجے میں بولا: ”اب یہ نہ کہیے گا کہ آپ کو اپنا نام بھی نہیں معلوم۔“

میں نے بڑی بے چینی اور اضطراب سے اپنے ذہن کو کھنگالنے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے ذہن کے ویرانوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ اور گھبر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

”میرا نام..... میرا نام!“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ درد کی ٹیسیں اب شدت اختیار کر چکی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کھوپڑی ٹکڑے ہو کر بکھر جائے گی۔ میں کوشش کے باوجود اپنا نام یاد نہیں کر سکا میں خود کو گم کر چکا تھا۔ میری شخصیت میرے ذہن کے تاریک ویرانوں میں کھو چکی تھی۔!

اچانک ڈاکٹر جمالی بول پڑا: ”بس کیجیے انسپکٹر!..... آپ انہیں پوری طرح ہوش میں آنے کے لیے وقت دیں۔ طویل بے ہوشی کے بعد ذہن ایک دم صاف نہیں ہو جاتا۔!“

انسپکٹر جو گیندر کی آنکھوں میں لہراتے ہوئے شکوک کے سائے کچھ گہرے ہو گئے۔

”مجھے نقاہت محسوس ہو رہی ہے۔“ میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”آپ ایک گلاش دودھ پی لیں۔ فی الحال آپ کو اور کوئی غذا نہیں دی جائے گی۔“ ڈاکٹر جمالی نے کہا اور گھنٹی بجا کر نرس کو بلایا۔ اسے دودھ لانے کی ہدایت کرنے کے بعد وہ پھر انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مناسب ہوگا کہ آپ شام تک انتظار کر لیں۔“



”ایک منٹ ڈاکٹر۔“ اچانک جو گیندر نے آگے جھک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ دایاں ہاتھ تھا جس کی منجھلی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ انگوٹھی میں نگینے کی جگہ سیاہ پتھر کی ایک چھوٹی سی پٹی تھی جس پر ہیروں سے، انگریزی حروف تہجی کا پہلا حرف بنایا گیا تھا۔

”ادھر دیکھیے!“ انپکٹر تیزی سے بولا ”شاید اسے دیکھ کر آپ کو اپنا نام یاد آ جائے۔“

میں نے غور سے اپنی انگوٹھی کی طرف دیکھا۔ چمک دار ہیروں سے بنے ہوئے اس حرف کو دیکھ کر میں بڑبڑایا: ”اے..... شاید یہ میرے نام کا پہلا حرف ہے۔ لیکن میرا نام.....؟ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے انپکٹر! مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔“

”شاید آپ یاد کرنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہیں۔“ انپکٹر نے منہ بنا کر کہا اور پھر کھڑا ہوتا ہوا بولا: ”خیر! میں شام کو پھر آؤں گا۔“ اگر اس وقت بھی آپ کو کچھ یاد نہیں آیا تو.....“ انپکٹر نے دھمکی آمیز طور پر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

اسی وقت نرس دودھ کا گلاس لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ جیسے ہی وہ میرے بستر کے قریب پہنچی، مجھے نیچے سے کسی بلی کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ نرس ایک دم اچھل پڑی۔ غالباً کوئی بلی میرے بستر کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی جس پر نرس کا پیر پڑ گیا تھا جب وہ اچھلی تو دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر ا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ دودھ فرش پر پھیل گیا۔ بلی جو شاید بھوک تھی، جھپٹ کر دودھ چاٹنے لگی۔

## کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

”م..... میں..... معافی چاہتی ہوں ڈاکٹر!“ نرس ہکلائی۔

”کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر جمالی نے نرم لہجے میں کہا: ”کسی سوپہر کو بلوا کر فرش صاف کروادو اور مریض کے لیے اور دودھ لے آؤ! آئیے انسپکٹر! آپ کو برآمدے تک چھوڑ آؤں۔“

انسپکٹر جوگیندر اور ڈاکٹر جمالی دروازے کی طرف مڑ گئے نرس ابھی تک شپٹائی ہوئی سی کھڑی ہوئی تھی مجھے وہ اس حالت میں بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ اس کے نقوش تو نظر فریب تھے ہی لیکن جسم بھی بڑا گدرا یا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ کمر پر بندھی ہوئی کپڑے کی بیلٹ نے اس کے جسمانی خطوط کچھ اور ابھار دیے تھے میں چند لمحوں کے لیے اپنی تکلیف اور الجھنوں کو فراموش کر بیٹھا اور ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔

دفعتاً کمرے میں بلی کی ایک دلخراش آواز گونج اُنھی۔ انسپکٹر جوگیندر اور ڈاکٹر جمالی اس وقت دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے بلی کی چیخ سن کر وہ تیزی سے مڑے۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے بلی کو فرش پر تڑپتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ بلی کے منہ سے اب بھی ایسی غرائیں نکل رہی تھیں۔ جیسے اندر ہی اندر اس کا کلیجہ کٹ رہا ہو۔ وہ بری طرح تڑپتی ہوئی فرش پر ادھر سے ادھر لڑھک رہی تھی۔

ڈاکٹر جمالی اور انسپکٹر جوگیندر تیزی سے آگے آئے۔

”یہ کیا ہوا!“ ڈاکٹر جمالی کے منہ سے نکلا۔

”زہر۔“ انسپکٹر جوگیندر ہونٹ بھیج کر بولا: ”اس دودھ میں زہر تھا۔“

اس کے منہ سے یہ الفاظ سننے ہی میرا تمام جسم سنسنا اٹھا ظاہر ہے کہ وہ دودھ میرے لیے تھا۔

”زہر!“ ڈاکٹر جمالی چونکا۔

”ہاں۔“ انسپکٹر جوگیندر نے مضبوط لہجے میں کہا: ”میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ دودھ زہریلا تھا۔“

بلی کی ایک خوفناک چیخ کمرے میں گونجی اور پھر اس کا جسم ہمیشہ ہمیش کے لیے ساکت ہو گیا۔

نرس کی حالت بے حد متغیر تھی۔ اگر اس نے دیوار کا سہارا نہ لے لیا ہوتا تو شاید گر ہی پڑتی۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ انسپکٹر جوگیندر اسے گھورتا ہوا بولا۔

”تم خود کو زیر حراست سمجھو!“

اس بات نے نرس کے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیے اور وہ ہڈیانی سے انداز میں چیخنے لگی: ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں قسم کھاتی ہوں میں نے دودھ میں کچھ نہیں ملا یا میں بے قصور ہوں۔ میں بے قصور ہوں۔“

وہ چیختی رہی اور ڈاکٹر جمالی اس طرح منہ پھاڑے کھڑا رہا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

نرس کی چیخ و پکار سن کر ہسپتال کے کچھ اور لوگ بھی کمرے میں گھس آئے تھے اور ادھر میری یہ حالت تھی جیسے میرا جسم غبارے کی طرح ہلکا ہو کر فضا میں اڑتا چلا جا رہا ہو۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور کنہیاں سلگنے لگی تھیں۔ اب واقعی اس میں شک و شبہ



کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ کوئی مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا مگر کون.....؟ یہ بات مجھے یاد نہیں آرہی تھی۔ میں تو اپنے آپ ہی کو فراموش کیے بیٹھا تھا۔ میرے ذہن کے ویرانوں میں خود میری ہی شخصیت کھو چکی تھی۔ اس شخصیت کا کھوج لگانے کے لیے میں نے اس لمحے اپنے ذہن پر اتنا دباؤ ڈالا کہ درد کی ٹیسیں کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں اور میرا ذہن پر سکوت اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسی کمرے میں، اسی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے ارد گرد خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن ڈاکٹر جمالی اور انسپٹر جوگیندر اس وقت بھی کمرے میں میرے قریب موجود تھے۔ میں نے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا تو انسپٹر جوگیندر بولا پڑا۔

”یہ آپ پر دوسرا قاتلانہ حملہ تھا۔ میں نے آپ کی حفاظت کے لیے دو کانسٹیبل مامور کر دیے ہیں لیکن اگر آپ نے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تو آپ کے دشمنوں کا سراغ لگانا میرے لیے محال ہوگا۔ آخر آپ کے ماضی میں ایسا کیا راز دفن ہے کہ آپ اسے چھپانے پر مصر ہیں۔ کیا آپ اب بھی اپنی زبان بند رکھیں گے۔؟“

”میں آپ کو کیا بتاؤں انسپٹر! میں آپ کو کیا بتاؤں؟“ میرے لہجے میں بے بسی تھی۔ ”آخر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا کہ میں کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“

”انسپٹر“ ڈاکٹر جمالی خشک لہجے میں بولا: ”بہتر ہوگا کہ اب آپ میرے مریض کو تنہا چھوڑ دیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ پلیز!“

انسپٹر جوگیندر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کھڑا ہو گیا میں نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس کے وزنی جوتوں کی دھمک کو دور ہوتے ہوئے سن رہا تھا۔ پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی میں نے محسوس کیا ڈاکٹر جمالی اب بھی میرے قریب موجود ہے میں نے اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنی تھی جس سے یہ سمجھ لیتا کہ وہ بھی انسپٹر کے ساتھ میرے کمرے سے چلا گیا ہوگا۔ اس کی موجودگی کے احساس کے باوجود میں نے آنکھیں نہیں کھولی۔ چند لمحے بعد پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس مرتبہ کمرے میں آنے والی ایک نرس تھی لیکن یہ وہ نہیں تھی جو میرے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی تھی۔

ڈاکٹر جمالی اسے کسی قسم کا انجکشن تیار کرنے کی ہدایات دینے لگا۔ پھر جب اس نے مجھے آنکھیں کھولے ہوئے دیکھا تو نرم لہجے میں بولا۔

”آپ آرام کیجیے! کچھ یاد کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ذہن پر دباؤ نہ ڈالیے۔ جو کچھ بھی یاد آتا ہے خود ہی یاد آ جائے گا۔“

”شکر یہ ڈاکٹر..... لیکن میں اتنا ضرور جاننا چاہوں گا کہ دودھ والے معاملے کا کیا ہوا۔!“

”اس بات سے آپ کا مقصد اگر یہ جاننا ہے کہ دودھ میں زہر کس نے ملایا تھا تو میں آپ کو بتاؤں کہ ابھی تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ دیے زہبی کو پولیس نے حراست میں لے لیا ہے۔“

”زہبی اس نرس کا نام ہے۔؟“

”ہاں..... لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ بے قصور ثابت ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے آپ سے کوئی دشمنی ہو اور یہ بات بھی طے ہے کہ وہ کسی کا آلہ کار نہیں بن سکتی۔“

میں نے پھر ایک سوال کرنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ ڈاکٹر جمالی ہاتھ اٹھا کر بولا: ”بس اب خاموش رہیے۔! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“

میں چپ ہو گیا لیکن میں نے آنکھیں بند نہیں کیں۔ میں نرس کو انجکشن تیار کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ ایک سانولی سلونی لڑکی تھی لیکن اس کے نقش و نگار بلا کی سیکس اپیل رکھتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی بار بار آنکھوں سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ اس کی یہ حرکت تازہ لینے کے بعد میرے دل میں کچھ نرم و نازک سے جذبات بیدار ہونے لگے اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے ایسا لگا جیسے میرے تصور کے پردے پر ایک سایہ قہر قہرار ہا ہو۔ وہ ایک نسوانی ہیولا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ نسوانی ہیولی تیزی سے واضح ہوتا چلا گیا۔ وہ چہرہ بھی میرے لیے اجنبی ہی تھا لیکن پھر بھی مجھے یوں لگا جیسے میرا دل اس کی طرف کھینچتا چلا جا رہا ہو۔ وہ ایسی ہی تھی کہ اسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بہک سکتی تھی۔ بڑا خوبناک سا، روشن روشن چہرہ تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جمیل کی سی گہرائی تھی۔ ہونٹ سلگتے ہوئے سے تھے اور سرخ و سفید جلد پھولوں کی طرح نرم و نازک معلوم ہو رہی تھی۔ سیاہ بال اس طرح لہرا رہے تھے جیسے بے شمار سانپ کسی کو ڈسنے کے لیے بے چین ہوں۔

میرے دل کی دھڑکنیں بیکنے لگیں اور جسم میں ایک سیما بی سی تڑپ جاگ اٹھی۔ اسی وقت میرے بازو میں چھن ہوئی تو میں نے ایک سسکاری سی لی اور میرا خواب بکھر سا گیا لیکن میرے جسم میں اگڑا نیاں لینا ہوا کیف و سرور دو چند ہو چکا تھا۔ کوئی خواہش بیدار ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی طوفان کسی بند کو توڑ دینا چاہتا ہو۔

ڈاکٹر جمالی میرے بازو میں انجکشن لگا رہا تھا اور نرس اس کے پیچھے کھڑی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے سے نظریں ملنے ہی اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ نظریں چرا لینا چاہتی ہو لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر رہی۔ ایک ننگ میری طرف دیکھتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی سحر میں گرفتار ہو گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں کوئی پیغام تھا جو وہ مجھے دینا چاہتی تھی۔ شاید میرے لاشعور نے اس پیغام کو سمجھ بھی لیا کیونکہ میں نے قدرے سکون محسوس کیا تھا لیکن میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ اس پیغام کو صرف سمجھ لینا ہی میرے لیے کافی نہیں ہے مجھے کچھ اور بھی درکار تھا۔ اپنے تصور کے پردے پر اس خواب ناک سے چہرے کو دیکھ کر میرے دل میں جو ہلچل مچی تھی وہ آسانی سے سکون آشنا نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے جذبات بھڑک رہے تھے اور کوئی اندرونی احساس مجھے بتا رہا تھا کہ یہ کیفیت میرے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں ہمیشہ سے اس خواب ناک چہرے کو دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا جا رہا ہوں۔ اس کی چاہت کی کبھی نہ بھنے والی آگ میں جھلتا رہا ہوں اور اسے قریب نہ پا کر، اسے حاصل کرنے میں ناکام رہ کر جھنجھلاہٹ کا



شکار بھی ہوا ہوں اور پھر اس جھنجھلاہٹ کے باعث جذبات کی اس آگ میں دوسروں کو بھی جھلسا تا رہا ہوں تڑپا تا رہا ہوں۔

”اب آپ آرام کریں۔“ ڈاکٹر جمالی کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی: ”میں نے ذہن کو پرسکون کرنے والی دوا کا انجکشن دیا ہے۔ جب آپ سو کر اٹھیں گے تو آپ کا ذہن بالکل ہلکا پھلکا ہو چکا ہوگا۔“

نرس کے سانوے سلونے چہرے کو دیکھتے دیکھتے میری پلکیں جھکتی چلی گئیں اور جلد ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

جب میں بیدار ہوا تو کمرے میں بجلی کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار گیر گھڑی میں سات بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ بستر کے قریب ہی ایک آرام کرسی پر نیم دراز نرس کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ بڑی بے تکلفی سے سامنے تپائی پر پھیلا رکھی تھی۔ اسکرٹ کافی اوپر سرک گیا تھا اور اس کی بھری بھری سڈول پنڈلی میری نظروں کے سامنے تھی۔

”نرس“ میں نے اسے دھیمی آواز میں پکارا۔

اس نے چونک کر تپائی سے ٹانگ ہٹائی اور کھڑی ہوتی ہوئی اپنے اسکرٹ کو درست کرنے لگی۔

”جاگ گئے آپ؟“ وہ مسکرائی تھی۔

”ہاں..... اور اب بڑی شدید بھوک محسوس کر رہا ہوں۔“

”میں ابھی آپ کے لیے کھانا منگواتی ہوں۔“

وہ کھانے کا انتظام کرنے کے لیے کمرے سے چلی گئی اور میں غیر ارادی طور پر اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے ابھی تک اپنا ماضی یاد نہیں آ سکا تھا۔ بہت کوشش کے بعد صرف دو چہرے ذہن کی تاریکیوں سے ابھر سکے تھے۔ اس لڑکی کے چہرے کو دیکھ کر تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس سے کچھ خوش گوار یادیں وابستہ ہوں لیکن اس بوڑھے کا چہرہ یقیناً میرے لیے منفی جذبات رکھتا تھا۔ وہ چہرہ میرے ذہن کی تاریکیوں سے ابھرا ہی اس وقت تھا جب انسپکٹر جوگیندر نے میرے کسی دشمن کے بارے میں جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسی بوڑھے کو مجھ سے کوئی دشمنی تھی اور اسی لیے وہ مجھے ہلاک کرنے کے درپے آزاد تھا۔ اس نے مجھے ختم کرنے کی دو کوشش کر ڈالی تھیں لیکن میں خوش قسمت تھا کہ اس کوشش بار آور نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کی تیسری کوشش بھی ناکام ہو جاتی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔

جب میرے لیے کھانا آ گیا تو میں نرس سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کھانے میں تو زہر ملا ہوا نہیں ہے۔؟

”نہیں“ وہ مسکرائی اب آپ کے کھانے پینے کی جو چیز بھی اس کمرے میں آئے گی وہ پولیس کی چیکنگ کے بعد ہی آئے گی۔“

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور پھر پوچھا: ”انسپکٹر جوگیندر پھر تو نہیں آیا تھا۔“

”سات بجے آیا تھا لیکن چونکہ آپ سو رہے تھے اس لیے ڈاکٹر جمالی نے اسے ٹال دیا۔ اب شاید وہ کل صبح سے پہلے نہیں آئے

گا۔“

”نرس آخر مجھے ہو کیا گیا ہے؟ میں اپنے آپ کو کیوں بھول گیا ہوں۔؟“

”آپ کی یادداشت چلی گئی ہے۔“

”یادداشت چلی گئی ہے۔؟“

”ہاں“

”تو پھر مجھے یہ بھی بھول جانا چاہیے تھا کہ میں مرد ہوں اور تم عورت! یہ زمین ہے اور وہ دیواریں۔ یہ برتن ہیں اور یہ لباس

ہے۔ آخر میں ان سب باتوں کو کیسے یاد رکھے ہوئے ہوں۔“

”گمشدہ یادداشت کے اکثر کیسز میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ یادداشت مکمل طریقے پر نہیں جاتی، آدمی اپنی ذات سے متعلق کچھ

باتیں بھول جاتا ہے مگر کچھ باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اسے پارٹیل امینیا کہتے ہیں۔“

”ایسا کیوں ہوتا ہے نرس؟“ میرا سوال کچھ بچکانہ سا تھا۔ وہ مسکرائی اور پھر اس نے کہا: ”یہ آپ ڈاکٹر جمالی سے پوچھئے گا شاید

وہ آپ کو سمجھا سکیں۔“

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اچانک میں نے کہا: ”کھانا بہت مزیدار

ہے۔ یہاں کی سروس بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ نرس! جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک سڑک پر میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ایسی صورت میں تو

مجھے کسی سرکاری ہسپتال کے جنرل وارڈ میں ہونا چاہیے تھا۔“

”یہ ہسپتال سرکاری ہی ہے لیکن حکومت نے ایک نئی اسکیم کے تحت تمام سرکاری ہسپتال میں پرائیویٹ روم بنوا دیئے ہیں جو لوگ

اخراجات برداشت کر سکتے ہیں ان کو ایسے ہی کمروں میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ حکومت اس طرح ان ہسپتالوں کو خود کفیل بنانا چاہتی ہے۔“

”لیکن یہ کیسے سمجھ لیا گیا میں یہاں کا خرچ اٹھا سکوں گا۔!“

## سیکریٹ ایجنٹ

**سیکریٹ ایجنٹ** ایک منفرد اور دلچسپ ناول ہے۔ انگریزی ادب سے لی گئی ایک کہانی، جس کا ترجمہ ڈاکٹر صابر علی ہاشمی نے کیا ہے۔

ایک ہنستی مسکراتی تحریر ہے، جس میں سسپنس، ایکشن کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کا عنصر بھی شامل ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک عام شہری

ہے جو اپنے دوست کے دعوت دینے پر سیکریٹ ایجنٹ بننے اور CIA کے ساتھ کام کرنے کی حامی بھر لیتا ہے اور پھر سلسلہ شروع ہو جاتا ہے

دلچسپ واقعات سے بھرپور، ایک انوکھی سراغ رسانی کا۔ **سیکریٹ ایجنٹ** کو **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔



”آپ اپنی وضع قطع سے کوئی معمولی آدمی نظر نہیں آئے تھے۔“ نرس نے جواب دیا۔ میری نظریں بے اختیار اپنی انگٹھوٹھی پر پڑیں اور میں نے سوچا کہ ہیرے کی انگٹھوٹھی پہننا تو واقعی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ تو کیا واقعی میں کسی بہت بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں؟ یہ سوچتے ہوئے میرا ذہن قدرے چکرایا تو میں نے فوراً سوچنا بند کر دیا اور اپنی ساری توجہ کھانے کی طرف مبذول کر دی لیکن میرا صرف ایک ہاتھ کام کر رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ کی معذوری کھانے میں دشواری کا باعث تھی۔ میری بے بسی دیکھ کر نرس بولی:

”میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ اگر آپ برانہ مانیں تو میں کھلا دوں؟“

”اوہ..... ضرور..... شکریہ“ میں نے یہ کہہ کر چھری کانٹے اس کی طرف کر دیے اور پھر بولا: ”تمہارا نام کیا ہے نرس!“

”آسیہ“

”خوبصورت نام ہے۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس بات پر اس نے بڑی قاتل نظروں سے میری طرف دیکھا اور دھیرے سے ہنس پڑی۔ ہنسنے کے انداز میں بھی سیکس اپیل تھی۔ اس نے مجھے بچوں کی طرح کھانا کھلانا شروع کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ ایک عجیب سی لذت محسوس کر رہی تھی۔ اچانک میں نے اس سے پوچھا۔

”آسیہ! کیا میں واقعی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہوں۔“

اس نے ہاتھ روک کر غور سے مجھے دیکھا اور پھر بڑے جذباتی سے انداز میں بولی: ”بالکل پرنس معلوم ہوتے ہیں۔ خوابوں کی سرزمین کے شہزادے۔“

آسیہ کی آواز میں خفیف سی لرزش کو محسوس کر کے ایک بار پھر میرے خوابیدہ ذہن کے تار جھنجھٹا اٹھے۔ میرے جذبات کا الاؤ دہک اٹھا اور میں بے اختیار آسیہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں تک لے آیا۔ اسے چومتا ہوا بولا۔

”تم بہت اچھی لڑکی ہو آسیہ..... بہت پیاری۔“

میری یہ حرکت اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ وہ ششدر رہ گئی اور جب بے خودی کا وہ لمحہ گزر گیا تو خود مجھے بھی اس حرکت کی نزاکت کا احساس ہوا، تاہم میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور اسے آہستہ سے دباتا ہوا بولا:

”آسیہ! تمہیں میری یہ حرکت بری تو نہیں لگی؟“

لیکن آسیہ نے اس بات کا جواب دینے کے بجائے بڑی معصومیت سے کہا: ”پرنس! اب اگر میں اپنا ہاتھ کھینچ لوں تو یہ بے ادبی نہیں ہوگی۔؟“

میں نے ہنس کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا لیکن محسوس کر چکا تھا کہ آسیہ بھی کچھ نہ کچھ جذباتی ضرور ہو چکی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا، کیا میری شخصیت اتنی ہی پرکشش ہے کہ لڑکیاں پہلی ہی ملاقات میں میری طرف ملتفت ہو جائیں؟ اور یہ سوچتے ہوئے میں اچانک مضطرب ہو گیا مجھے خیال آیا تھا کہ میں اپنا چہرہ بھی فراموش کر چکا ہوں مجھے نہیں یاد تھا کہ میں کیسا ہوں۔ اور پھر میں خود کو دیکھنے کے لیے بے

چھین ہو گیا۔ میں نے آسیہ سے کہا: ”میں آئینہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں!“ وہ حیرت سے بولی۔

”مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ میں کیسا ہوں۔“

”اوہ! اچھا پہلے آپ کھانا تو کھا لیجیے۔!“

”نہیں، بس کھا چکا۔“

میں خود کو دیکھنے کے لیے اتنا ہی مضطرب ہو گیا تھا کہ بھوک پیاس سب اڑ گئی تھی۔ جب آسیہ آئینہ لے کر آئی تو میں نے اسے اس کے ہاتھ سے تقریباً چھین ہی لیا اور پھر اپنے عکس پر نظر پڑتے ہی میں دم بخود رہ گیا تھا۔

”میں نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا!“ آسیہ شوخی سے بولی: ”آپ بالکل پر نس نظر آتے ہیں نا۔!“

آئینے میں نظر آنے والا چہرہ، بلاشبہ اتنا ہی پرکشش تھا کہ جنس مخالف اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے آپ کو اتنا خوبصورت پا کر میں نے اپنے دل و دماغ میں جو کیفیت محسوس کی تھی اسے الفاظ کا جامہ پہنانا میرے بس کی بات نہیں لیکن بہر حال یہ بات طے ہے کہ اس وقت میں نے کچھ تکبر سا محسوس کیا تھا۔ میں کافی دیر تک آئینہ دیکھتا رہا اور پھر اس وقت چونکا جب آسیہ ہنستی ہوئی بولی: ”کیا رات اسی طرح گزار دیجیے گا پر نس۔!“

میں نے جھینپ کر آئینہ بستر ہی پر ایک طرف ڈال دیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

”آپ بالکل اپالو معلوم ہوتے ہیں۔“ آسیہ بولی۔

”اپالو؟“

”ہاں.....“ آسیہ نے کہا: ”یونانی دیو مالا کے حسین ترین دیوتا..... اپالو۔! کیا آپ اس کے بارے میں نہیں جانتے؟“

”اپالو۔“ میں اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”وہ تو شاید جنگجو اور تباہی و بربادی لانے والا مشہور ہے۔“

”اس کے ساتھ ساتھ وہ حسین اور تمام دیوتاؤں میں افضل بھی گردانا جاتا ہے۔“

”کیا واقعی میں بہت خوبصورت ہوں؟“

میں نے آسیہ کی طرف غور سے دیکھا تو وہ نظریں چرانے لگی۔

”ادھر دیکھو..... میری طرف۔“ میں نے آسیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں آپ سے نظریں نہیں ملا سکتی۔“ آسیہ بھرائی ہوئی آواز میں

بولی: ”جب آپ غور سے میری طرف دیکھتے ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ کی آنکھوں کی کشش میری روح کو میرے وجود سے کھینچنے لیے

جارہی ہو۔ آپ کی آنکھوں میں بلا کا سحر ہے۔“

”دیوتا جو ٹھہرا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔



آسیہ میرے ہاتھ کی انگلیوں سے کھیل رہی تھی۔ کوئی بھی ہمیں اس عالم میں دیکھتا تو یہی اندازہ لگاتا کہ ہم برسہا برس سے ایک دوسرے کے قریب رہتے چلے آئے ہیں۔ آسیہ کی یہ قربت میرے جذبات میں دھیمی دھیمی سی آنچ پیدا کر رہی تھی اور خود اس کا عالم بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا۔ اس کے تنفس کی ناہمواری سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ اس وقت مہکتے ہوئے شبتانوں میں مہک رہی ہے۔ میری خفیف سی اکساہٹ پر وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں آگرتی۔

دفعتاً قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

”ڈاکٹر جمالی۔“ آسیہ نے سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا اور برقی سرعت سے مجھ سے دور ہٹ گئی۔

آسیہ نے قدموں کی چاپ سن کر بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ وہ ڈاکٹر جمالی ہی تھا۔ اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے وہ کمرے میں داخل ہوا۔

”ہیلو!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے خوش دلی سے مسکرایا۔ ”مجھے اطلاع ملی تھی کہ آپ جاگ چکے ہیں۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔“

”کافی بشت محسوس کر رہا ہوں۔“

”میں اس وقت آپ سے ہسپتال کے اخراجات کے بارے میں گفتگو کرنے آیا ہوں۔“

”کیا مطلب!“

”جب آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو آپ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بریف کیس بھی تھا جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ فی الحال وہ بریف کیس پولیس کی تحویل میں ہے لیکن بالآخر وہ آپ کو واپس مل ہی جائے گا۔ اسی رقم میں سے ہسپتال کے اخراجات لے لیے جائیں گے۔ آپ کو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔؟“

”اعتراض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ڈاکٹر صاحب!“

”تو پھر ان کاغذات کی خانہ پری کر کے دستخط کر دیجیے۔!“ ڈاکٹر جمالی نے قلم نکالا اور کھول کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

ہسپتال کے دو فارم تھے جن پر مجھے دستخط کرنے تھے دونوں فارموں کی خانہ پری کی جا چکی تھی لیکن دو خانے خالی تھے۔ ان میں سے ایک میں میرا نام لکھا جانا تھا اور دوسرے میں پتا۔! میں نے وہ دونوں خانے پر کر کے دستخط کر دیے۔ ڈاکٹر جمالی نے بڑی بے تابی سے دونوں فارم مجھ سے واپس لیے تھے اس نے بڑے اشتیاق سے فارموں پر نظر ڈالی اور جب وہ بولا تو اس کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔

”خوب!..... تو آپ کو اپنا نام یاد آ گیا۔ لیکن یہ تو بڑا عجیب سا نام ہے۔ اپالو!“

میں نے مسکرا کر کہا: ”یونانی دیو مالا کے حسین دیوتا اپالو کے بارے میں آپ نے کچھ نہ کچھ تو پڑھا ہی ہوگا۔ یہ نام مجھے آسیہ نے دیا ہے اور پتا تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی ہسپتال کا ہے۔“

ڈاکٹر جمالی کا منہ لٹک گیا۔

”مجھے افسوس ہے ڈاکٹر کہ آپ کی یہ کوشش ناکام رہی۔“

میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا: ”آپ نے سمجھا ہوگا کہ میں بے خیالی میں اپنے دستخط کر جاؤں گا لیکن کاش میں ایسا کر سکتا۔ آپ تو میری اس بات کا یقین کر لیجیے۔ ڈاکٹر کہ میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔ ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو بس کچھ دھندلے دھندلے سے سائے ابھر کر رہ جاتے ہیں۔“

”آئی ایم سوری۔“ ڈاکٹر جمالی نے سنجیدگی سے کہا: ”در اصل یہ حرکت میں نے انسپکٹر جوگیندر کے اکسانے پر کی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ پر یقین ہے کہ آپ کسی وجہ سے اپنی شخصیت چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اس وقت بھی آپ سے ملنے پر بضد تھا لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔ اب وہ کل کسی وقت آئے گا۔ وہ شاید اس شے میں پڑ گیا ہے کہ آپ کسی جرم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس شے کی وجہ نوٹوں سے بھرا ہوا وہ بریف کیس ہے جو ایکسڈنٹ کے وقت آپ کے پاس تھا۔“

ڈاکٹر کی اس صاف گوئی پر میں مسکرا پڑا۔

”اچھا اب آپ آرام کیجیے۔“ ڈاکٹر جمالی بولا: ”ذہن پر فی الحال زور ڈالنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ سر کا زخم ٹھیک ہونے کا انتظار کیجیے..... ویسے ممکن ہے کہ آپ کو خود بخود بخود ہی سب کچھ یاد آ جائے۔“

آسیہ اس دوران میں بالکل خاموش کھڑی رہی تھی۔ ڈاکٹر جمالی کے جانے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی بولی:

”آپ کی حرکت بڑی دلچسپ تھی۔“

”کون سی حرکت!“

”یہی کہ آپ نے فارم پر اپالو کا نام لکھ دیا۔“

”کیا عجب کہ میرا نام واقعی یہ ہو۔“ میں نے اپنی اگٹھوٹھی پر بنے ہوئے ”اے“ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

آسیہ کا چہرہ سنجیدہ نظر آنے لگا اور وہ بولی: میں آپ کو آپ کی ایک ایسی چیز دے سکتی ہوں جو شاید آپ کو آپ کا ماضی یاد دلا

دے۔“

”کیا چیز ہے!“ میں تجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایک پرزہ کاغذ۔“ آسیہ نے جواب دیا اور پھر کہا: ”کل جب آپ کو حادثے کے بعد یہاں لایا گیا تھا تو اس کمرے میں میری

ہی ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ آپ کو ہسپتال کے کپڑے پہنائے گئے تھے اور آپ کا لباس مجھے دیا گیا تھا کہ میں وہ اس کمرے میں رکھ آؤں جہاں مریضوں کے ذاتی کپڑے رکھے جاتے ہیں۔ اس کمرے میں پہنچ کر آپ کا کوٹ میرے ہاتھوں سے گر گیا۔ جب میں نے جھک کر اسے اٹھایا تو کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ جیب سے نکل کر گر پڑا۔ آپ کے لباس کی تلاشی تو پولیس نے اچھی طرح لی ہوگی لیکن کسی طرح وہ پرزہ



جیب کے کونے میں پڑا رہ گیا ہوگا۔“

”وہ کہاں ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

آسیہ اس تپائی کی طرف بڑھی جس پر اس کا پرس رکھا ہوتا تھا۔ اس میں سے وہ پرزہ کاغذ نکال کر وہ میری طرف لوٹتی ہوئی بولی۔  
”غالبا یہ کسی ٹیلیگرام کا پھٹا ہوا ایک ٹکڑا ہے۔“

میں نے بڑی بے تابی سے کاغذ کا وہ ٹکڑا اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ پیغام تو پھٹ چکا تھا لیکن اس پیغام کا آخری لفظ ”پہنچو“ باقی رہ گیا تھا۔ اس کے نیچے پیغام بھیجنے والے کا نام لکھا ہوا تھا۔

”راج کمار کی کلدیہ کور آف زرنجن پور۔“

”راج کمار کی۔“ میں بڑبڑایا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایسی گونج پھیل گئی جیسے کوئی طیارہ اڑ رہا ہو۔

”راج کمار کی کلدیہ کور۔“ آسیہ میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی: ”آپ کو یاد آیا کچھ؟“

میں خاموش رہا۔ میرا ذہن ”راج کمار کی کلدیہ کور“ کے نام کے تکرار کیے جا رہا تھا۔ شاید اس وقت میرے چہرے پر کچھ وحشت سی برسنے لگی تھی کیونکہ آسیہ ایک دم گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے میرا شانہ پکڑا کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”ذہن پر اتنا دباؤ نہ ڈالے کہ نیس پھٹ جائیں۔“

”اوہ..... اوہ!“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا: ”میں پاگل ہو جاؤں گا آسیہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”لیکن آپ دماغ پر اتنا زور ڈالتے ہی کیوں ہیں۔ اگر آسانی سے کچھ یاد نہیں آتا تو چھوڑیے۔!“

”آخر کب تک آسیہ! کب تک؟ میں کب تک خود کو بھولے رہوں گا میرے ذہن کی تاریکیوں سے میری شخصیت کب ابھرے

گی۔؟“

”آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ آسیہ میرا شانہ تھپکتی ہوئی بولی اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بچے کو بہلا رہی ہو۔

میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں کچھ نڈھال ہو گیا تھا۔ ذہن میں آندھیاں سی اب بھی چل رہی تھیں اور راج کمار کی کلدیہ کور کا نام مرغولوں کی طرح چکرارہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آسیہ میرے سر ہانے بیٹھ گئی تھی وہ میری کنپٹیاں سہلانے لگی۔ اس سے مجھے اتنا سکون ملا کہ تھوڑی ہی دیر میں دماغی انتشار بالکل ختم ہو گیا اور میں نے آنکھیں کھول کر آسیہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بڑے جذباتی انداز میں بولا۔

”تم بہت اچھی ہو! آسیہ تم بہت اچھی ہو۔ ہر وقت یہیں میرے پاس رہنا ورنہ میرے دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی۔“

وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ کھنکھنائی ہوئی ہنسی۔

”لیکن میری ڈیوٹی تو صبح چار بجے ختم ہو جائے گی۔“ اس نے بتایا۔

”میں ڈاکٹر جمالی سے کہوں گا کہ میرے کمرے میں تمہاری ڈیوٹی رہنا چاہیے۔“

”تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں دن رات جاگتی رہوں۔ بالکل آرام نہ کروں۔!“

”میں کب کہتا ہوں کہ تم آرام نہ کرو۔ یہیں سو جانا۔“

آسیہ نے نظریں چرائیں اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی ”ابھی تو ابتدائی رات ہے۔“ میں نے کہا: ”لیکن آدھی رات کے بعد تو کوئی بھی ادھر نہیں آئے گا۔“

آسیہ اب بھی خاموش رہی۔ وہ کچھ جھپنی جھپنی سی نظر آنے لگی تھی۔

”آسی!“ میں قدرے توقف سے بولا۔

”ہوں۔“

”یہ زرنجن پور کہاں ہے۔“

”شمالی علاقے میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔“

”تم نے کبھی راج کمار کی کلدیہ کور کا نام بھی سنا ہے۔؟“

”نہیں لیکن یہ بہت غلط بات ہے کہ آپ پھر اپنے ذہن پر دباؤ ڈالنے لگے۔“

”دباؤ تو بالکل نہیں ڈال رہا ہوں آسیہ!..... صرف سوچ رہا ہوں کہ کسی راج کمار سے میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔!“

”اچھا ہی ہے کہ کچھ عرصے تک وہ تعلق آپ سے چھپا رہے۔“

”کیوں!“

”پھر شاید آپ مجھے بھول جائیں۔“ آسیہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

## پراسرار چیخیں

اردو جاسوسی ادب کے بانی، ابن صفی کی **عمران سیریز** سلسلے کا تیسرا ناول۔ اس ناول میں عمران نہ صرف فری لانسر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے بلکہ محکمہ سراغ رسانی میں ایک علیحدہ سیکشن بھی تیار کر رہا ہے۔ اس ناول میں عمران قتل کا ایک ایسا کیس حل کر رہا ہے جس میں مقتول دس برس کے بعد زندہ ہو کر واپس آ گیا ہے۔ ابن صفی کے جادوئی قلم کا کرشمہ۔ طنز و مزاح، حیرت اور تجسس سے بھرپور یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔



”تم بہت اچھی لڑکی ہو آئیہ! میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔“

آئیہ کھڑی ہو گئی۔

”کہاں چلیں!“

”آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔“ آئیہ دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

جب وہ دوا بنا رہی تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔

”زمبی کا کیا ہوا آئی! کیا پولیس نے اسے چھوڑ دیا؟“

”ابھی تو نہیں چھوڑا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی حرکت نہیں ہوگی۔“

”یقین تو مجھے بھی ہے۔“

”اس نے بیان کیا دیا تھا۔؟“

”جب وہ دودھ لے کر آ رہی تھی تو راہداری کے موڑ پر ایک آدمی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ وہ لڑکھڑا گئی تھی اور اس آدمی

نے جلدی سے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا دودھ کا گلاس پکڑ لیا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے گرنے سے بچانا چاہتا ہو لیکن اب زمبی کا خیال ہے کہ اس بہانے ہی سے اس شخص نے دودھ میں زہر ملایا ہوگا۔“

ہوں میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ہسپتال سے چھٹی ملتے ہی میں زرنجن پور کا رخ کروں گا۔

اگر وہ ٹیلی گرام مکمل ہوتا تو اس کا آخری فقرہ فوراً ”پہنچو“ ہوتا میں سوچنے لگا کہ ٹیلی گرام کے ذریعے اس قسم کا پیغام اسی وقت دیا

جاتا ہے جب کوئی خاص بات وقع پذیر ہوئی ہو وہ خاص بات کسی قسم کے خطرناک حالات بھی ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے کسی کو کسی کی مدد کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ کلدیب کو کو میری مدد کی ضرورت ہو۔!

اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا۔

رات گزرتی رہی اور میں اپنے خیالات میں کھویا رہا مجھے وقت کا احساس بھی نہیں رہا اور سوچتے سوچتے میرے سر میں درد ہونے

لگا۔ بے اختیار میرا ہاتھ سر کی طرف بڑھا لیکن اچانک کسی نے میری کلائی پکڑ لی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں آئیہ میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے! آپ کچھ بے چین نظر آ رہے ہیں۔!“ وہ بولی۔

”آں.....! ہاں..... آئیہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ جب سے اب تک مسلسل سوچ رہے ہیں۔!“

”کیا بج گیا؟“

”بارہ بجنے والے ہیں۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بس اتنا نکل سکا۔

”کیا بہت درد ہونے لگا ہے؟“

”ہاں۔“

”میں ابھی ٹھیک کیے دیتی ہوں۔“ آسیہ نے کہا اور آہستہ آہستہ میری کنپٹی سہلانے لگی۔ وہ مجھ پر کچھ اور جھک آئی تھی اور میں اس کے سانولے سلونے چہرے کو اپنے چہرے سے بہت قریب پارہا تھا میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔ ایک عجیب سا نشہ تیر رہا تھا ان میں! لمبی لمبی پلکیں جھکی پڑ رہی تھیں۔ اس کی یہ قربت میرے جذبات میں ہلچل مچانے لگی۔ اس کی مخروطی انگلیاں آہستہ آہستہ میری کنپٹی سہلا رہی تھیں۔ میرا درد کم ہوتا جا رہا تھا اور تمام اعصاب میں ہلکی ہلکی گدگدی سی ہونے لگی تھی۔

”درد کچھ کم ہوا؟“ آسیہ کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔

”تمہارے ہاتھ جادوگر ہیں آسیہ!“ میں نے سرگوشی کی۔ ”یوں لگ رہا ہے جیسے درد کبھی تھا ہی نہیں۔“

”جھوٹ!“

”سچ آسیہ! تمہاری قسم!“ میں بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کلائی اس کے کندھے پر رکھ دی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

”جی چاہتا ہے رات یونہی گزر جائے۔“ آسیہ نے جذبات سے بوجھل سرگوشی میں کہا: ”چند گھنٹوں میں مجھے ایسا معلوم ہونے لگا ہے جیسے..... جیسے.....“

”جیسے تم مجھے جنم جنم سے جانتی ہو۔ کیوں..... یہی کہنا چاہتی ہونا؟“

”نہیں میں کوئی ایسی بات کہنا چاہتی تھی جس میں اس جملے سے کہیں زیادہ شدت ہو۔“

”لیکن میرے لیے تمہارے یہ جذبات کیوں ہیں؟“ میں نے آسیہ کے سر کے پچھلے حصے پر دباؤ ڈالتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے چہرے پر کچھ اور جھکا لیا۔

”اس کا تجزیہ کرنا بہت مشکل ہے۔“ آسیہ نے جواب دیا۔

اب ہماری گفتگو سرگوشیوں میں ہو رہی تھی۔

میں نے کہا: ”اچھا یہ بتاؤ تم میرے لیے کہاں تک جاسکتی ہو!“

”موت کی منزل تک۔!“



لیکن زندگی اتنی ہی بے حقیقت شے ہے کہ اسے جذبات کی ایک لمحاتی رو پر قربان کیا جاسکے؟“

”جذبات کی رو تو وہ ڈوری ہے جس کے اشارے پر یہ ساری دنیا کھپتلی کی طرح ناچتی رہی ہے۔“

آسیہ کا جسم اب میرے سینے سے ٹکرا رہا تھا۔ میرے جذبات اب بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ میں نے ایک ہلکے سے جھٹکے سے اس کا چہرہ اپنے چہرے کے اتنا قریب کر لیا کہ دوئی کا وجود مٹ گیا۔ ہمارے ہونٹ ایک دوسرے کو زندگی کی بنیادی کہانیاں سنانے لگے۔ میرے اعصاب کسی ساز کے تاروں کی طرح جھنجھنا رہے تھے اور دل و دماغ میں ایک سرکش طوفان امنڈ رہا تھا جذبات کی وہ ازلی کہانی چھڑ چکی تھی جس کی شاخیں اب تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

طوفان امنڈتا رہا۔ اب اس کے سامنے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ اس کا جھرجھا چاہا، چلتا چلا گیا۔ اس وقت تک بہتا رہا۔ جب تک خود اس کی سانس نہیں اکھڑی پھر وہ جھاگ اڑاتا اور ہانپتا ہوا اس نکتے کی طرف واپس لوٹنے لگا جہاں سے اس نے سرکشی کا آغاز کیا تھا۔

پیار و محبت کے صحرا کی وسعتوں کو پھلانگ کر میں اتنا تھک چکا تھا کہ مجھے نیند آگئی۔ شاید اس وقت تین بجے تھے۔

صبح میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی نو بج رہی تھی۔ ایک نرس کو بھی میں نے کمرے میں پایا لیکن وہ آسیہ نہیں تھی اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

”صبح بخیر جناب!“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

”صبح بخیر۔“ میں نے آہستہ سے کہا: ”آسیہ کہاں ہے؟“

”اس کی ڈیوٹی چار بجے تک تھی۔“ نرس نے جواب دیا پھر بولی: ”آپ ناشتے میں کیا پسند کریں گے۔“

”سب کچھ لے آؤ۔ بہت زور کی بھوک لگی ہے۔“ میرا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ وہ ہنس پڑی اور ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ میں نے پھر چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ رات کا خمار میری رگ رگ میں اب تک تیر رہا تھا میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ آسیہ بڑے بھرپور جذبات کی لڑکی ہے۔

دس بجے تک میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو چکا تھا اور میں نے اس دوران میں کئی مرتبہ خود سے یہ سوال کر ڈالا تھا۔ کہ میں کون ہوں لیکن اس سوال کے جواب میں میرا ذہن کسی گونگے کی طرح خاموش تھا۔

سو اس بجے ڈاکٹر جمالی کچھ ایسے بے تحاشہ انداز میں میرے کمرے میں داخل ہوا جیسے طوفانِ نوح کی آمد طانی کی اطلاع دینے آیا ہو۔

”ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ وہ چھوٹے ہی بولا۔

”مجھ سے؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں دراصل انسپکٹر جوگیندر نے آج کے دو تین اخبارات میں آپ کی تصویر چھپوا دی ہے۔ تصویر کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی شائع ہوا ہے کہ اگر کسی کو آپ کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو وہ پولیس سے رابطہ قائم کرے۔ ڈاکٹر جمالی نے یہ تفصیل بتاتے ہوئے کہا: ”اسی اعلان کو پڑھ کر وہ آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔ غالباً وہ آپ کو جانتا ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اسے یہاں بلواؤں؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا میرا دل اس خیال سے دھڑک اٹھا تھا کہ شاید اب میری شخصیت مجھ پر آشکار ہو جائے گی۔ میں اپنے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔ دنیا کا کوئی بھی شخص خود فراموشی کی دلدل میں پھنسا رہنا گوارہ نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر جمالی میرا جواب سنتے ہی کمرے سے چلا گیا اور جب بمشکل ایک منٹ بعد واپس لوٹا تو ایک پستہ قد اور فربہ اندام شخص اس کے ساتھ تھا۔ اس نے صاف ستھرے اور قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے۔ عمر پینتالیس پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ تھا اور دائیں ہاتھ میں واکنگ اسٹک۔

میں نے اسے غور سے دیکھا لیکن نہیں پہچان سکا۔ وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر ذہن کے تاریک گوشوں سے کوئی ایسی بات نہیں ابھر سکی جو اس اجنبی سے میرے تعلق کو آشکارا کر سکتی۔

لیکن اجنبی بڑے جو شیلے انداز میں ”نواب صاحب، نواب صاحب“ کہتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے لینا لینا چاہتا ہو لیکن میں بت بنا بیٹھا ہوا تھا۔ میری یہ بے حسی دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ گر گئے۔

”یہ کیا ہو گیا نواب صاحب! یہ کیا ہوا ہے!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں ایک ٹک سے اسے دیکھتا رہا۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا اور اسی لیے وہ لمحات میرے لیے بڑے اذیت ناک تھے۔

ڈاکٹر جمالی نے آہستگی سے اجنبی کو کندھے پر ہاتھ دیا اور کہا: ”مت بھولے کہ یہ اپنی یادداشت کھو چکے ہیں۔“

”اوہ..... جی ہاں، جی ہاں۔“ اجنبی نے جلدی سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بڑے مغموم سے لہجے میں بولا: ”کیا آپ مجھے بھی نہیں پہچانے نواب صاحب.....! میں طارق زبیری ہوں آپ کا پرنسپل سیکریٹری۔“

”میرا نام کیا ہے؟“ مجھے خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

”آپ کا نام خاور جنگ ہے۔“ اجنبی نے کہا اور ایسی متوقع نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے صرف نام ہی سن کر مجھے سب کچھ یاد آ جائے گا۔

”خاور جنگ۔“ میں نے زیر لب دہرایا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ نام کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ میں چند لمحوں اپنے ذہن پر زور دیتا رہا اور پھر مایوسانہ انداز میں سر ہلانے لگا۔ جب میں بولا تو میری آواز بھرائی ہوئی تھی: ”مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ میرے ذہن میں ماضی کے گوشوں پر دھند چھائی ہوئی ہے۔“



”میں ان گوشوں کو روشنی میں لا کر رہوں گا۔“ طارق زبیری نے پر جوش لہجے میں کہا: ”میں آپ کو ایک ایک بات یاد دلا دوں گا نواب صاحب!..... آپ زیادہ دیر تک ذہن کی بھول بھلیوں میں گم نہیں رہ سکتے۔“

”میرا گھر کہاں ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”نرنجن پور!..... میرے ذہن میں چھنا کہ سا ہوا۔ مجھے وہ ادھورا ٹیلیگرام یاد آ گیا تھا جو آسیہ کو میرے کوٹ کی جیب سے ملا تھا۔ وہ ٹیلیگرام دینے والی راج کمار کی کلبہ بک کور آف نرنجن پور تھی۔“

”نرنجن پور۔“ میں نے زیر لب دہرایا۔

”جی ہاں۔“ طارق زبیری نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نرنجن پور جس کی گلیاں آج بھی آپ کے لیے اداس ہیں ان گلیوں میں آپ کا بچپن گزرا اور جوانی آئی۔ وہ گلی کو چے آج بھی آپ کی شوخیوں کو یاد کرتے ہیں۔ وہاں کی فضاؤں میں آج بھی آپ کے قہقہوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔“

مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ذہن میں گولے سے اٹھنے لگے میں اپنی یادداشت کو کریدنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ طارق زبیری کی آواز اب مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”ایک سال ہوا جب آپ نے بڑے صاحب سے روٹھ کر نرنجن پور کی فضاؤں کو خیر آباد کہا تھا۔ کاش آپ اس چھوٹی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بناتے۔ آپ کی یاد میں روتے روتے نواب صاحب کی آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں۔ اگر یہاں کے اخبارات ان تک پہنچے اور انہوں نے پولیس کا وہ اعلان پڑھ لیا تو یقیناً وہ دوڑے ہوئے یہاں آئیں گے۔ باپ کی شفقت، بیٹے کی ضد کے آگے ہار چکی ہے۔ آج سے چھ ماہ قبل ہی انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ زبیری اگر خاور واپس لوٹ آئے تو میں اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کی خواہش کے آگے سر جھکا دوں گا۔“

زبیری بڑی جذباتی کر رہا تھا لیکن میرے جذبات میں کوئی ہلچل نہیں مچی، مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ میں خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”سنیے مسٹر زبیری! ڈاکٹر جمالی بولا۔“

طارق زبیری جذبات میں ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ اس اچانک مخاطب پر چونک پڑا۔ چھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے بستر کے نیچے گر گئی۔

”او معاف کیجیے گا۔“ اس نے جھینپ کر کہا اور چھڑی اٹھانے کے لیے جھکا۔

میرا طلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے نرس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

”پانی۔“

طارق زبیری چھری سنبھال کر سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر جمالی نے اس سے کہا: ”کیا آپ بتائیں گے میرے مریض کے والد زرنجن پور میں کس رُتبے کے آدمی ہیں۔“

”وہ..... وہ.....“ طارق زبیری نے بڑے پر جوش انداز میں کہا: ”وہ زرنجن پور کی بہت بڑی شخصیت ہیں۔ خطاب یافتہ اور امیر و کبیر..... راجہ صاحب کے بعد وہ زرنجن پور کے سب سے بڑے آدمی ہیں۔“

”راجہ صاحب کون؟“

”زرنجن پور کے راجہ شمشیر سنگھ۔“

”اچھا اچھا۔“ ڈاکٹر جمالی نے سر ہلایا اور پھر کہا: ”میرے مریض..... میرا مطلب ہے خاور جنگ صاحب کس بات پر اپنے والد سے روٹھے تھے۔؟“

”یہ..... یہ ایک بہت ہی نجی قسم کا معاملہ ہے ڈاکٹر صاحب!“ طارق زبیری نے ہچکچاتے ہوئے کہا: ”مجھے اُمید ہے کہ اس سلسلے میں میری خاموشی کا آپ برا نہیں مانیں گے۔“

”بے شک مجھے کسی کے نجی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن میں یہ بات اس لیے معلوم کر رہا تھا کہ شاید اسے سن کر خاور جنگ صاحب کی یادداشت لوٹ آتی۔“

”میں تنہائی میں ان سے وہ ساری باتیں کر لوں گا جو ان کے ماضی سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔“

”تو کیا ہم آپ کو تنہا چھوڑ دیں؟“

”یقیناً میں آپ سے تنہائی کی درخواست کروں گا لیکن فی الحال میں بڑے نواب صاحب کو ٹرنک کال کرنا چاہتا ہوں۔“

## گلریا کا آدم خور

**گلریا کا آدم خور** برٹش آرمی کے ایک سابق بریگیڈئیر جمشید ار جاسپ خان کیانی کی آپ بیتی ہے، جسے عبیدہ اللہ بیگ نے کہانی کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ **گلریا کا آدم خور** ۴۰ کی دہائی کی ایک شکاری مہم ہے جو ایک طرف اُس وقت کے راجھستان اور راجھستانی راجاؤں کی آن بان کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے تو دوسری طرف تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کی راہ میں آنے والی سیاسی ریشہ دوانیوں اور ان دیکھی تو توں کی پس پردہ سازشوں سے نقاب اٹھاتی ہے۔ اس داستان میں بعض ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جو اس خطہ کے جغرافیائی نقشہ کو کسی اور ہی رخ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب آپ بہت جلد کتاب گھر پر دیکھ سکیں گے۔



”ضرور ضرور۔ آپ ہسپتال کا ٹیلی فون استعمال کر سکتے ہیں۔“

نرس نے مجھے پانی کا گلاس دیا جو میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور پھر طارق زبیری کی طرف دیکھنے لگا جو مجھ سے کہہ رہا تھا۔

”نواب صاحب! میں ابھی آتا ہوں۔ دس منٹ میں۔“

میں جواب میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

”ڈاکٹر صاحب!“ طارق زبیری نے ڈاکٹر جمالی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”جب میں ٹیلی فون پر بڑے

نواب صاحب سے گفتگو شروع کروں، اس وقت کمرے میں کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے۔“

”بہتر ہے! ایسا بندوبست بھی ہو جائے گا۔“

وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور ان کے قدموں کی آہٹ دو ہوتی چلی گئی میں خالی خالی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس وقت چونکا جب نرس کی آواز سنائی دی۔

”لیٹ جائیے! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“

”شکریہ نرس!“ میں نے طویل سانس لے کر کہا: ”کیا تم مجھے وہ اخبارات فراہم کر سکتی ہو جن میں میری تصویر شائع ہوئی ہے۔“

یقیناً کیوں نہیں۔ نرس نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

میرا ذہن طارق زبیری کی شخصیت میں الجھا ہوا تھا لیکن اب بھی مجھے کوئی بات یاد نہیں آرہی تھی۔ میری یادداشت پر اندھیرے کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔

نرس اخبار لے آئی اور اس نے وہی صفحہ میرے سامنے کر دیا جس پر میری تصویر اور پولیس کا اعلان شائع ہوا تھا۔ اس اعلان کو پڑھ کر میری پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس اعلان میں کہیں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں کس ہسپتال میں زیر علاج ہوں۔ صرف یہ لکھا گیا تھا کہ یہ تصویر جس شخص کی ہے۔ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے اس لیے اگر کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلومات ہوں تو وہ اس سلسلے میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرے۔ میں اس الجھن میں پڑ گیا کہ جب اعلان میں ہسپتال کا کوئی تذکرہ نہیں تھا تو پھر طارق زبیری سیدھا یہاں کیسے آگیا۔۔۔۔۔؟ میں تیزی سے سوچنے لگا۔ میرے ذہن میں شکوک و شبہات انگڑائیاں لے رہے تھے۔ چونکہ دو مرتبہ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی جا چکی تھی لہذا اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ میرا نام معلوم دشمن پھر کوئی حرکت کر بیٹھتا۔ یہ بات ممکن تھی کہ طارق زبیری اسی سلسلے کی کوئی کڑی ہوتا۔

دفعاً میرے ذہن میں چھنا کہ سا ہوا۔ مجھے ایک اور بات یاد آئی تھی۔ حیرت انگیز بات! طارق زبیری نے میرا نام خاور جنگ بتایا تھا جبکہ میری انگوٹھی پر ”اے“ بنا ہوا تھا۔ اگر میرا نام خاور جنگ ہوتا تو میری انگوٹھی پر ”کے“ بنا ہوا ہوتا۔

میں مضطربانہ انداز میں اپنے بستر سے کھڑا ہو گیا۔

”کیوں کیوں! کیا بات ہے!“ نرس جلدی سے بولی۔

”وہ ضرور کوئی فراڈ ہے۔“ میں نے تیز سرگوشی کی۔

”کون!“ نرس حیرت سے بولی۔

”طارق زبیری وہ یقیناً میرے دشمنوں کا ایجنٹ ہے۔“ میں یہ کہتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔

”ارے ارے..... سنئے تو.....! ٹھہریے..... مسٹر!“ نرس چیخ۔

لیکن میں دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ جوش کے عالم میں مجھے چل پہننا بھی یاد نہیں رہی تھی۔ میں طارق زبیری کو پکڑنے کے لیے پاگلوں کی طرح دوڑ پڑا تھا اور میری یہی حرکت میری زندگی کی ضامن بن گئی میں راہداری میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور اور میرا کمرہ لمبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ دھماکہ ایسا تھا کہ شاید سارے ہسپتال کے درودیوار ہل گئے ہوں گے۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں اوندھے منہ گر پڑا۔ اس دھماکے نے میرے دماغ کی نس نس کو ہلا کر رکھ دیا۔ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلتی چلی گئی اور میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

جب مجھ کو ہوش آیا تو میں نے خود کو ہسپتال کے نرم گدیلے بستر پر پڑا ہوا پایا۔ ایک نرس مجھ پر جھکی ہوئی میرا سر سہلا رہی تھی۔ لیکن یہ وہ نرس نہیں تھی جو آسیہ کے بعد میرے کمرے میں آئی تھی ڈاکٹر جمالی اور جو گیندر بھی میرے قریب موجود تھے۔ مجھ کو ہوش میں آتا دیکھ کر نرس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور پیچھے ہٹ گئی۔

”اوہ..... ڈاکٹر! مجھے کیا ہو گیا تھا۔؟“ میرے منہ سے نکلا۔

”دھماکے نے آپ کے اعصاب پر گہرا اثر چھوڑا تھا جس کے باعث آپ بے ہوش ہو گئے تھے۔“ ڈاکٹر جمالی نے کہا: ”آپ جس کمرے میں تھے وہ لمبے کا ڈھیر بن چکا ہے۔“

میرا ذہن اب کام کرنے لگا تھا اور مجھے اس دھماکے سے متعلق ساری باتیں یاد آگئی تھیں۔ اگر میں طارق زبیری کی طرف سے مشکوک ہو کر اسے پکڑنے کے لیے دوڑ نہ پڑتا تو یقیناً اس کمرے کے ساتھ میرے جسم کے بھی چیتھڑے اڑ جاتے۔ گویا میرے دشمنوں کا ایک اور حملہ نام کام ہو چکا تھا۔

”لیکن وہ سب کیسے ہو گیا؟“ میں بڑبڑایا۔

”یہ تو ہمیں آپ ہی بتائیں گے۔“ انسپکٹر جو گیندر نے تیز لہجے میں کہا۔ ”آخر آپ کے دل میں کمرے سے بھاگ نکلنے کا خیال کیوں آیا تھا۔“

”طارق زبیری فراڈ تھا۔“ میں نے جواب دیا اور پھر یہ بھی بتانے لگا کہ اس کے فراڈ ہونے کا احساس مجھے کن باتوں کی وجہ سے



ہوا تھا۔ وجوہات بیان کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ”بس انہی خیالات کی بنا پر میں اسے پکڑے کے لیے دوڑ پڑا تھا اور میری یہی اضطراری حرکت دشمنوں کی ناکامی کا سبب بن گئی۔“

”کیا وہ شخص آپ کے کمرے میں ٹائم بم چھپا گیا تھا؟“

”غالباً کوئی ایسی ہی بات ہونا چاہیے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر سوچتا ہوا بولا: ”ٹھہریے! مجھے ایک خیال آرہا ہے۔ شاید میرا اندازہ درست ہو۔ ڈاکٹر! آپ کو یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ آپ کے اچانک مخاطب پر وہ چونک پڑا تھا اور چھڑی اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی میرا خیال ہے کہ چھڑی اس نے دیدہ دانستہ گرائی تھی اور جھک کر اسے اٹھاتے وقت اس نے چپکے سے میری آہنی مسہری کے نیچے ڈی لیڈ ایکشن چپکا دیا ہوگا۔ مسہری چونکہ لوہے کی تھی لہذا بم چپکانے کے لیے مقناطیسی قوت استعمال کی جاسکتی ہے۔“

”بہت خوب!“ انپکٹر جو گیندر نے چھتے ہوئے لہجے میں کہا: ”آپ یہ ساری باتیں جانتے ہیں لیکن آپ کو اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں!“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر جمالی سے بولا: ”ڈاکٹر..... اس دھماکے سے کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا۔؟“

”وہ کانسٹبل کافی زخمی ہو گیا ہے جو آپ کے کمرے کے دروازے پر مامور تھا۔ وہ دیوار سے لگا ہوا اونگھ رہا تھا جب آپ کمرے سے نکل کر بھاگے۔ آپ کے بھاگنے کی آہٹ پر وہ چونکا اور پھر آپ کی طرف جھپٹا لیکن اسی وقت دھماکہ ہو گیا اور کمرے کی دیواروں کے کئی ٹوٹے ہوئے حصے اس پر جا پڑے۔“

”اور زرس؟“

”وہ بیچاری ہلاک ہو گئی۔“ ڈاکٹر جمالی نے مغموم لہجے میں کہا: ”وہ غالباً اس وقت دروازے سے نکل ہی رہی تھی جب دھماکہ ہوا۔“

”اوہ! مجھے اس اطلاع سے صدمہ پہنچا تھا پھر میں نے چونک کر پوچھا۔“ اور ہاں.....! طارق زبیری.....“

”وہ جل دے کر نکل گیا۔“ ڈاکٹر جمالی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: ”چونکہ اس نے ٹرنک کال کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اس لیے میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اسے وہاں چھوڑ کر میں باہر نکل آیا کیونکہ وہ تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن یہ دراصل اس کی چال تھی تنہائی میں اسے بھاگ نکلنے کو موقع بڑی آسانی سے مل سکتا تھا۔ میرے کمرے کے دروازے ہیں لہذا اسے بڑی آسانی سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔“

”میرے دشمن کافی تیز ہیں۔“ میں بڑبڑایا۔

”اور کسی دن یہ تیزی رنگ لا کر رہے گی اگر آپ نے اب بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا:“ جو گیندر نے الفاظ چباتے ہوئے

کہا۔

”انسپکٹر!“ میں بڑی معصومیت سے بولا: ”میری طرف دیکھیے.....! غور سے دیکھیے! کیا میں واقعی جھوٹا اور مکار نظر آتا ہوں۔“ انسپکٹر جو گیندر نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اس نے میری آنکھوں کی گہرائی میں جھانکنے کی کوشش کی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے کچھ گھبراتے ہوئے انداز میں اپنی نظریں جھکا لیں۔

”مائی گاڈ!“ اس کے منہ سے نکلا: ”آپ کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں کوندتی ہیں، میں نظر بھر کر آپ کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ آخر آپ کی آنکھوں میں کیا بات ہے۔“

”ان کی آنکھیں بے حد غیر معمولی ہیں۔“ ڈاکٹر جمالی سنجیدگی سے بولا: ”میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے کہ میں ان سے نظریں ملا کر بات نہیں کر سکتا۔“

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں اچنبھے میں پڑ گیا تھا آخر ایسی کیا بات تھی۔ میری آنکھوں میں؟ آئیہ نے بھی کل رات یہی کہا تھا کہ وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا سکتی۔!

”آخر ایسی کیا بات ہے میری آنکھوں میں!“ میں بڑبڑایا۔

”ہوگی کچھ..... اس وقت ہم کو اس مسئلے پر الجھنے کی ضرورت نہیں، چلے میں مانے لیتا ہوں کہ آپ واقعی یادداشت کھو بیٹھے ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر آپ کو سب کچھ یاد آ ہی جائے تو میں آپ کو تنبیہ کرتا ہوں کہ اس عرصے میں آپ ہسپتال سے باہر ہونے کی کوشش نہ کیجیے گا ورنہ میں یہی تصور کروں گا کہ آپ نے مجھے دھوکہ دیا اور کسی وجہ سے اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے خود کو گمشدہ یادداشت کا مریض ظاہر کیا۔“

”آپ مطمئن رہیں۔ اگر میں اس حالت میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں تو یہ میری حماقت ہوگی۔“

## ریشمی خطرہ

**مسعود جاوید** کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔ جرم و سزا اور جاسوسی و سراغ رسانی پر ایک منفرد تحریر۔ ایک ذہین قابل اور خوبصورت خاتون (پرائیوٹ) سراغ رساں کا دلچسپ قصہ، ایک مجرم اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ان کی ممکنہ شادی کی شرط بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک نہایت دلچسپ سنسنی خیز ناول۔ سراغ رساں کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جاننے کے لیے پڑھیے..... **ریشمی خطرہ** جو کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔



انسپکٹر جوگیندر چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور پھر ڈاکٹر جمالی سے بولا: ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

انسپکٹر جوگیندر کے ساتھ ڈاکٹر جمالی بھی کمرے سے چلا گیا۔ وہ جوگیندر کو برآمدے تک چھوڑنے گیا ہو۔

ان کے جاتے ہی میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ حالات بڑی نازک صورت اختیار کر چکے تھے میں اپنی گمشدہ ہستی کو یاد کرنے کی اذیت میں مبتلا تھا اور میرے نامعلوم دشمن میری زندگی کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مجھ پر تین مرتبہ حملہ ہو چکا تھا لیکن قسمت نے یادری کی تھی کہ میں بچ گیا تھا۔ تاہم اس بار کی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی کہ میری قسمت کب تک یادری کرے گی۔ یہ تو طے تھا کہ میرے دشمن چین سے بیٹھنے والے ہرگز نہیں تھے۔ گوکہ انسپکٹر جوگیندر نے میری حفاظت کے انتظامات کچھ اور سخت کر دیے ہوں گے لیکن یہ بات مجھے گوارہ نہیں تھی کہ میری زندگی کسی اور کی مرہون منت رہے۔ میں اپنی حفاظت خود کرنا چاہتا تھا اور اس پر عملدرآمد کی واحد صورت یہی ہو سکتی تھی کہ میں اس ہسپتال سے فرار ہو جاؤں۔ اس طرح میں پولیس کے ساتھ ساتھ اپنے دشمنوں کی نظروں سے بھی اوجھل ہو جاتا اور پھر مجھے مستقل طور پر نہ سہی لیکن کوئی پناہ گاہ ضرور مل سکتی تھی۔

میرا ذہن تیزی سے کام کرتا رہا اور میں نے جلد ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ میں نرنجن پور کا رخ کروں گا۔ میری جیب سے نکلنے والے ٹیلیگرام کا پتہ ہوا حصہ نرنجن پور کی کسی راج کماری کلدی ب کور کی طرف اشارہ کرتا تھا اور اگر یہ بات فرض کر لی جائے کہ وہ ٹیلیگرام میرے ہی لیے تھا تو یہ بات بھی یقینی تھی کہ راج کماری کلدی ب کور میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوگی۔ مجھے یہ بات بھی یاد تھی کہ طارق زبیری نے بھی نرنجن پور ہی کا نام لیا تھا۔ غالباً اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے اسے کسی ایسے مقام کا نام لینے کی ضرورت تھی جو خیال نہ ہو چنانچہ وہ شعوری یا شعوری طور پر نرنجن پور کا ذکر کر بیٹھا تھا۔

راج کماری کلدی ب کور کا ٹیلیگرام اور طارق زبیری کی بات سے مجھے یہ باور آ چلا تھا کہ نرنجن پور سے میرا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوگا۔ بہت ممکن تھا کہ نرنجن پور کی جانی پہچانی گھیلوں میں قدم رکھتے ہی میری یادداشت واپس لوٹ آتی اور میں خود کو پہچان لیتا۔

اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا کہ نرنجن پور پہنچ کر میری یادداشت واپس آ سکتی ہے میرا اضطراب اس قدر بڑھا کہ میں نے ایک خطرے کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ وہ خطرہ یہ تھا کہ ہسپتال سے فرار ہو کر میں پولیس کی نظروں میں بے حد مشکوک ہو جاتا اور پولیس مجھے اس طرح تلاش کرنا شروع کر دیتی جیسے کسی مجرم کو تلاش کرتی ہے۔

شام کو آسید ڈیوٹی پر آئی۔ ہم والا واقعہ اس کے علم میں آچکا تھا اور وہ اس کی بناء پر بے حد خوفزدہ تھی۔ وہ آتے ہی میرے سینے سے لگ گئی اور بڑبڑانے لگی۔

”اوہ..... پرنس! میرے پرنس.....! خدا نخواستہ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں بھی اپنی زندگی کے ہر سانس کو خیر آباد کہہ دیتی۔“

میں آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگا مجھے اس جذباتی لڑکی سے ہمدردی تھی۔ نہ جانے کیوں اس نے مجھے اپنے من مندرکاد یو تا مان لیا تھا جب کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں بن سکی تھی۔ گزشتہ رات جو کچھ ہوا تھا وہ تو ایک جذباتی اہال کا نتیجہ تھا۔ منفی اور

مثبت قوتیں جب ایک دوسرے سے مس ہوتی ہیں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن بہر حال! مجھے اب اس جذباتی لڑکی کا تعاون درکار تھا میں آج دن میں اپنے فرار کا مکمل منصوبہ سوچ چکا تھا اور مجھے اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے آسیہ کی مدد کی ضرورت تھی۔

میں نے بڑی محبت سے آسیہ کے ہونٹ چوم لیے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر اپنے قریب بٹھاتا ہوا بولا: ”آسیہ! تمہیں یاد ہوگا، کل رات تم نے کہا تھا کہ میری خاطر تم موت کی منزل تک جاسکتی ہو۔ کہا تھا نا؟“

”ہاں کہا تو تھا۔ کیوں!“ آسیہ نے غور سے میری طرف دیکھنا چاہا لیکن نظریں ملتے ہی گھبرا کر سر جھکا لیا۔ میرا ذہن ایک بار پھر اس خیال سے الجھنے لگا کہ آخر میری آنکھوں میں ایسی کون سی قوت ہے کہ لوگ مجھ سے نظریں ملا کر بات نہیں کر سکتے یقیناً وہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں اس غیر معمولی بات کا سراغ لگانے میں الجھ جاتا میں نے اس الجھن کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور آسیہ سے بولا۔

”اب وقت آگیا ہے کہ تمہارے اس دعوے کا امتحان ہو جائے۔“

”آسیہ! میری زندگی خطرے میں ہے۔ اگر میں اس ہسپتال میں رہا تو ضرور مارا جاؤں گا۔ تین مرتبہ کی ناکامی کے بعد میرے دشمن چوتھی مرتبہ بڑا جامع منصوبہ بنا کر مجھ پر حملہ کریں گے۔ پولیس کے یہ معمولی سے حفاظتی انتظامات مجھے نہیں بچا سکتے اس لیے میں اس ہسپتال سے فرار ہو جانا چاہتا ہوں۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

”فرار۔“ آسیہ چونک پڑی۔

”ہاں آسیہ.....! اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔“ میں نے مدہم لہجے میں کہا: ”اور اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

آسیہ نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے سر جھکائے اپنے ناخنوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جب وہ بولی تو اس کی آواز میں جذبات انگریز لرزش تھی۔

”میں نے جو دعویٰ کیا تھا اسے پورا کر کے دکھاؤں گی آپ جو کچھ بھی کہیں میں کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن دکھ صرف اس بات کا ہے کہ پھر شاید میں آپ کو کبھی نہ دیکھ سکوں۔“ آسیہ کی آنکھوں سے دو آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے۔

”ارے ارے..... پگلی!“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا اور جھک کر اس کی آنکھوں کے آنسو چوم لیے پھر بولا: ”باؤلی..... میں نے یہ کب کہا کہ میں تجھے بھول جاؤں گا۔ میں تجھے بھول ہی نہیں سکتا۔ اپنے دشمنوں سے نپٹنے کے بعد میں تیرے پاس واپس آؤں گا۔“

”جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔“ آسیہ بے حد مغموم ہو گئی تھی۔



”آسیہ..... ادھر دیکھو! میری طرف!“

آسیہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک بار میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”میں واپس آؤں گا آسیہ! میں قسم کھاتا ہوں کہ واپس آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔“ میں نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

”اچھا۔“ وہ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی: ”آپ کہتے ہیں تو یقین کیے لیتی ہوں۔ میں ساری زندگی آپ کا انتظار کروں

گی۔“

”اچھا اب سنو کہ تمہیں میری کیا مدد کرنا ہے۔“

آسیہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے جلدی جلدی اسے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہی۔ آخر میں میں نے اس سے کہا۔

”بس اب جاؤ اور جا کر ڈاکٹر جمالی سے کہو کہ اچانک میری حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ اس بہانے سے تم اس کو یہاں لے آؤ۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔“

آسیہ چند لمحوں تک مجھ سے نظریں ملائے بغیر میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی میں نے منصوبے کے دوسرے مرحلے کی تیاری شروع کر دی۔ میں سخت قسم کی ورزش کرنے لگا جس سے میری سانس پھول جائے اور جسم سے پسینہ بہہ نکلے میرے زخمی ہاتھ کی پٹی آج صبح ہی کھل چکی تھی کیونکہ معمولی سا زخم اس عرصے میں بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ صرف سر پر اب بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

جلد ہی میرا سانس پھول گیا اور جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ پھر جیسے ہی مجھے تیزی سے قریب آتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں میں لپک کر بستر پر لیٹ گیا اور چادر سینے تک اوڑھ لی۔ جلد ہی دروازہ کھلا اور آسیہ ڈاکٹر جمالی کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر جمالی کے ہاتھ فلیٹ ہیٹ تھا ممکن ہے اس وقت وہ کہیں جا رہا ہو جب آسیہ نے اسے میرے بارے میں اطلاع دی ہوگی۔

”کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ ڈاکٹر جمالی کہتا ہوا تیزی سے میرے بستر کے قریب آ گیا۔“

”اوہ..... ڈاکٹر..... ڈاکٹر!“ میں کراہتا ہوا بولا: ”مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ یاد آنے لگا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی..... آہ..... اچانک مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میرا دل..... میرا دل ڈوبا جا رہا ہے..... اوہ ڈاکٹر! خدا کے لیے جلدی کچھ کیجیے!“

میرے چہرے پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطرات دیکھ کر ڈاکٹر جمالی کو میری باتوں کا یقین آ گیا۔ اس نے آسیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”گلو کو زائجکشن..... ہری آپ!“



آسیہ فوراً دروازے کی طرف بڑھ گئی اور ڈاکٹر جمالی اپنا سینٹھو اسکوپ سنبھالتا ہوا جلدی سے میرے بستر پر بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے چادر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے جسم سے الگ کر دی اور دونوں ہاتھ ڈاکٹر جمالی کی گردن کی طرف بڑھائے۔ اس نے بوکھلا کر پیچھے ہٹنا چاہا لیکن میری پھرتی سے مات کھا گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے چیخ نکل سکتی، اس کی گردن پر میرے ہاتھوں کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔ میں نے اسے بستر پر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ ڈاکٹر جمالی کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرت بھی نظر آرہی تھی اور خوف بھی..... میں اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس قسم کے کام میں پہلے بھی کئی مرتبہ کر چکا ہوں۔ میرے جسم میں ایک عجیب سی لذت آمیز سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اور میں خود کو کسی چیتے کی طرح پھرتیلا اور طاقتور محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جمالی بے حس و حرکت ہو گیا تو میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ نہ جانے کیسے مجھے یہ اندازہ تھا کہ گردن پر اتنا دباؤ پڑنے سے ڈاکٹر جمالی کی سی کاٹھی کے لوگ مر نہیں سکتے، صرف بے ہوش ہوتے ہیں۔

میں نے جلدی سے ہسپتال کا لباس اپنے جسم سے اتار پھینکا اور ڈاکٹر جمالی کے کپڑے اتار کر پہننے لگا۔ آسیہ کو میں نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ واپسی میں کم از کم دس منٹ لگائے اس دوران میں مجھے یہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ واپس آ کر آسیہ کمرے میں ڈاکٹر جمالی کو بے ہوش پڑا دیکھ کر شور مچا دیتی لیکن اتنی دیر میں تو میں ہسپتال سے نکل چکا ہوتا۔

میں نے ڈاکٹر جمالی کا لباس پہن کر اس کی ایپرن بھی پہن لی اور سر پر ڈاکٹر جمالی ہی کی فیلٹ جیٹ اس طرح جمالی کہ پٹیاں دکھائی نہ دے سکیں۔ میں نے یہ سارے کام اتنی پھرتی سے کیے تھے کہ بمشکل سات منٹ صرف ہوئے میں تیزی سے دروازے کے قریب پہنچا اور پھر دروازہ کھول کر بڑے اطمینان سے باہر نکل گیا۔ میں نے تنکھیوں سے کانسٹبل کی ایک جھٹک دیکھ لی تھی۔ دروازے کے باہر وہ دائیں جانب کھڑا ہوا تھا اس لیے میں بائیں طرف مڑ گیا اور ایپرن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے، بڑے اطمینان سے آگے بڑھتا چلا گیا میں قد و قامت میں ڈاکٹر جمالی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا اور اسی لیے مجھے امید تھی کہ کانسٹبل دھوکہ کھا جائے گا۔

## دیوانہ ابلیسی

**عشق کا قاف** اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار

واقعات سے بھرپور، سغلی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی صوفشائیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلادی ہے کہ گمراہی اور ان دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے۔**



میرا خیال درست ثابت ہوا۔ کانسٹبل نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آسیہ نے مجھے ہسپتال کے نقشے سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے مجھے باہر نکلنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ یہ ایک شاہراہ تھی میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا اور پھر میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر جمالی کے اسٹیٹھو اسکوپ اور ایپرن سے نجات حاصل کی۔ دونوں چیزیں میں نے گلی میں نظر آنے والے کوڑے کے ایک ڈرم میں پھینکیں اور پھر پتلون کی جیبوں کا جائز لیا۔ اڑتالیس روپے اور کچھ ریزگاری ہاتھ لگی۔ اس رقم کے علاوہ ڈاکٹر جمالی کے چند وزٹنگ کارڈ بھی تھے جو ظاہر ہے کہ میرے کسی کام نہیں آسکتے تھے۔ البتہ ایک کام کی چیز مجھے اور ملی۔ وہ تاریک شیشوں کی ایک عینک تھی۔

دوسری شاہراہ پر پہنچ کر میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا مجھے نہ صرف یہ کہ نرنجن پور پہنچنے کی جلدی تھی بلکہ میرے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں جلد از جلد یہ شہر چھوڑ دوں۔

نرنجن پور کا ٹکٹ مجھے سترہ روپے میں ملا۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ ریاست یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے اور میں دوسرے دن دوپہر سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکوں گا۔

میرا ستارہ اس وقت عروج پر تھا کیونکہ ٹرین وہاں سے صرف دس منٹ بعد روانہ ہونے والی تھی۔ اگر اس میں دیر ہوتی تو میرے لیے خطرات پیدا ہو سکتے تھے کیونکہ انسپکٹر جو گیندرا اپنی گارڈ کے ساتھ سب سے پہلے اسٹیشن ہی کا رخ کرتا۔

میری وہ رات ٹرین میں کٹی۔ دوسرے دن گیارہ بجنے میں دس منٹ پر میں نرنجن پور پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر ہی اخبارات کی سرخیاں میری نظر سے گزریں اور میں انہیں دیکھتے ہی چونک پڑا۔ کوئی اخبار ایسا نہیں تھا جس میں میری خبر نہ چھپی ہو۔ دو ایک نے تو وہ خبر شہ سرخیوں کے ساتھ چھاپی تھی۔ میں نے اخبار بیچنے والے ایک چھوٹے سے لڑکے سے ایک ایسا اخبار خرید لیا جس نے میری خبر کو بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔

اخبار خرید کر میں اسٹیشن کے قریب ہی ایک ریسٹورینٹ میں جا بیٹھا۔ گوکہ فیلٹ ہیٹ اور تاریک شیشوں کی عینک کے باعث مجھے آسانی سے نہیں پہچانا جاسکتا تھا لیکن میں نے احتیاطاً ایک گوشے کی میز کا انتخاب کیا اور کرسی بھی ایسی منتخب کی کہ ریسٹورینٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ میری صرف پشت دیکھ سکیں صرف بائیں جانب کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ میرا نصف چہرہ دیکھ سکتے تھے۔

ویٹر آیا تو میں نے اسے کھانے کا آرڈر دیا اور میز پر اخبار پھیلا کر اپنے متعلق شائع ہونے والی خبر پڑھنے لگا۔ میرے فرار کا واقعہ خاصہ نمک مرچ لگا کر پیش کیا گیا تھا اور مجھ پر ہونے والے حملوں کی تفصیل بھی موجود تھی۔ میری شخصیت کے بارے میں عجیب عجیب قیاس آرائیاں کی گئی تھیں پولیس کے خیال کے مطابق میں کوئی بہت بڑا مجرم تھا جس نے اپنی شخصیت چھپانے کے لیے یادداشت کھوجانے کا ڈھونگ رچایا تھا۔

یہ ساری باتیں میرے لیے غیر متوقع نہیں تھیں لیکن ایک بات پڑھ کر میں چونک گیا۔ رپورٹر نے معتبر ذرائع کے حوالے سے لکھا تھا کہ چند غیر ملکی سفارتخانوں کے اعلیٰ افسر میرے بارے میں پوچھ گچھ کرتے پھر رہے تھے اور ایک اعلیٰ برطانوی افسر نے بھی میری تلاش



میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ بات بڑی مبہم اور اڑی اڑی سی تھی لیکن رپورٹر نے بڑے یقین سے سنسنی خیز انکشافات کی پیش گوئی کی تھی۔

یہ سب کچھ پڑھ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ پولیس کی دلچسپی تو سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن حکومت برطانیہ اور دوسرے کئی ملکوں کا مجھ میں دلچسپی لینا نہ صرف حیرت انگیز بلکہ بے حد پراسرار تھا۔

ویر کھانا لے آیا تھا کھانے کے دوران میں بھی میرا دماغ خیالات سے الجھتا رہا۔ مجھے اپنی شخصیت اب بڑی پراسرار اور عجیب و غریب معلوم ہونے لگی تھی۔

آخر میں کون ہوں؟

میں کیا ہوں؟

یہ سوال میرے ذہن میں ہتھوڑوں کی طرح برستے رہے۔ میری گمشدہ شخصیت اب میرے لیے اذیت ناک ہوتی جا رہی تھی۔ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ اگر میں نے جلد ہی اپنی شخصیت کا سراغ نہ لگالیا تو سوچ سوچ کر میرے دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی۔

میں جیسے تیسے کھانا ختم کیا اور پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بائیں جانب کی میزوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا آدمی بڑے مشکوک انداز میں میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ فلیٹ ہیٹ سر پر کچھ اوپر کھسک گئی ہے اس لیے سر پر بندھی ہوئی پٹی کی جھلک نظر آرہی ہوگی۔ میں نے جلدی سے فلیٹ ہیٹ درست کی اور پھر اسی میں عافیت جانی کہ فوراً اس ریسٹورنٹ سے رخصت ہو جاؤں۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کاؤنٹر کی طرف گیا اور کھانے کا بل ادا کر کے ریسٹورنٹ سے نکل آیا فوراً ہی مجھے ایک ٹیکسی بھی مل گئی اور اس میں بیٹھتے وقت میں نے ٹیکسیوں سے دیکھا کہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے والا بھی ریسٹورنٹ سے نکل آیا تھا اور اب کھڑا ہو کف افسوس مل رہا تھا کیوں کہ قرب و جوار میں کوئی دوسری ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اس خیال سے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ بد بخت اب میرا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔

”راج محل“ میں نے ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی حرکت میں آ گئی۔

میں ایک مصیبت سے بچ نکلا تھا لیکن میرے دل میں یہ خدشات موجود تھے کہ مجھے ابھی ایسی اُن گنت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

زنجن پور کی شاہراہوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے میں نے اپنے ذہن پر کافی زور دیا۔ لیکن مجھے کوئی گوشہ بھی جانا پہچانا نہیں محسوس ہوا۔ آخر تھک کر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور نشست کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ راج محل پہنچ کر مجھے کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں ایک ریاست کی راج کماری سے ملنے جا رہا تھا لیکن مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ راج کماری سے میرے تعلقات کس قسم کے ہیں اور ہیں بھی یا نہیں؟ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ ٹیلیگرام میرے بجائے کسی اور کے لیے ہو لیکن کسی وجہ سے میری جیب تک پہنچ گیا ہو۔



اب میں سوچتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ شاید اس وقت میرا دماغ ٹھیک سے سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا ورنہ مکمل معلومات حاصل کیے بغیر میں راج محل کا رخ نہ کرتا۔

ٹیکسی ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے جاڑی اور میں کرایہ ادا کر کے ٹیکسی سے اتر گیا۔ ٹیکسی واپس چلی گئی۔

راج محل کے پھاٹک کے باہر دوسرا پیکر تو پیش نصب تھیں۔ پھاٹک بند تھا لیکن پھر بھی مسلح سنتری وہاں مامور تھے۔ انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا کیونکہ میں اپنے حلیے سے کوئی بہت برا آدمی نہیں معلوم ہو رہا تھا۔

میں سیدھا پھاٹک کے قریب پہنچا اور ان لوگوں سے راج کماری کلدیب کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔ دونوں سنتری چونک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ میں پھر بولا۔

”کیا راج کماری یہاں نہیں رہتیں؟“

”یقیناً یہیں رہتی ہیں۔ آپ چند منٹ توقف کریں۔“

ایک سنتری نے کہا اور پھر لپک کر لکڑی کے اس کیبن میں چلا گیا جو پھاٹک کی بائیں جانب بنا ہوا تھا۔ ٹیلیفون کے تار اس کیبن سے عمارت تک چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ ٹیلیفون پر راج کماری کو میرے بارے میں اطلاع دے رہا ہوگا لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہوا تھا کہ اس نے میرا نام معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ایک منٹ بعد وہ کیبن سے نکل آیا اور مجھ سے انتظار کے لیے کہا۔

اب میں کچھ بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے محل کی طرف سے ایک گاڑی آتی نظر آئی۔ اگلی ہی سیٹوں پر دو باوردی آفیسر موجود تھے اور انہی میں سے ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ گاڑی پھاٹک کے قریب آرکی۔ ایک آفیسر اس میں سے اتر آیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا:

”پھاٹک کھولو۔!“

سنتریوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

”تشریف لائیے جناب!“ آفیسر نے مجھ سے کہا۔

میں ہچکچاتا ہوا آگے بڑھا اور پھاٹک سے گزر گیا۔

”تشریف لائیے۔!“ آفیسر پھر بولا اب وہ گاڑی کے پچھلی نشست کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

میرے بیٹھنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور پھر اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ فوراً ہی گاڑی حرکت میں آئی اور وسیع و عریض روش پر ”یو“ ٹرن لے کر واپس روانہ ہو گئی۔

اب تک مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا گیا تھا اور یہ بات میری بے چینی میں اضافہ کرتی چلی جا رہی تھی۔

گاڑی محل کے صدر دروازے پر جا کر رکی۔ اسی آفیسر نے پھرتی سے اتر کر میرے لیے دروازہ کھولا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا

جیسے میں راج محل کا کوئی معزز مہمان ہوں لیکن اس رویے کے باوجود میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنی حماقت سے کسی خطرے میں آ پھنسا ہوں۔ مجھے راج محل کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اب میں وہاں تنہا تھا۔ وہ آفسروں کے چلا گیا تھا۔ میں نے تجسس نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں آرائش و زیبائش کی ہر وہ چیز موجود تھی جو کسی راجہ کے محل میں متوقع ہو سکتی ہے۔ اس کمرے کی سجاوٹ پر زریں صرف کیا گیا تھا مگر نہ جانے کیوں میں ان سب چیزوں سے ذرہ برابر بھی مرعوب نہیں ہوا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو۔

کمرے کے کئی دروازے تھے جن پر جھلملاتے ہوئے بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ قدموں کی آہٹ سن کر میں ایک دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا پردہ ہٹا اور ایک ایسی شخصیت کمرے میں داخل ہوئی جو بھاری بھر کم اور انتہائی وجہیہ تھی۔ اس کی عمر چالیس پچاس کے درمیان معلوم ہوتی تھی اور وہ سکھ راجاؤں کی روایتی زرق برق پوشاک میں ملبوس تھا میں اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ میرا کھڑا ہونا محض ایک رسمی تعظیم تھی۔ میں اس سے مرعوب ہرگز نہیں ہوا تھا اور میں نے یہ بات بھی سمجھ لی تھی کہ وہ راجہ شمشیر سنگھ تھا۔

”بہت خوب!“ ایک بھاری بھر کم آواز کمرے میں گونجی ”تو تم کل دیب کور سے ملنے آئے ہو؟“

”جی ہاں۔“

”مجھے تمہاری اس دیدہ دلیری پر حیرت ہے نو جوان!“ راجہ شمشیر سنگھ ہونٹ بھیج کر بولا: ”کل ہی تم نے ہماری بیٹی کو اغوا کیا تھا اس لیے یہ بات ہمارے سامان و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ آج تم پھر یہاں آ جاؤ گے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

”مقصود بننے کی کوشش مت کر لو گے۔“ شمشیر سنگھ غرایا: ”کل تم ہمارے سامنے ہماری بیٹی سے ملاقات کرنے آئے تھے اور پھر نہ تو ہماری بیٹی کا پتا چلا اور نہ تم دکھائی دیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تم دونوں ہوا میں تحلیل ہو گئے ہو۔ لیکن خیر! اب تم خود ہی ہمارے چنگل میں آ پھنسے ہو۔ راجہ شمشیر سنگھ تمہاری روح کو بھی چیخنے چلانے پر مجبور کر دے گا۔ تم یہ بتانے پر مجبور ہو جاؤ گے تم نے ہماری بیٹی کل دیب کور کو کیوں اغوا کیا تھا اور اب وہ کہاں ہے۔“

”آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا اور اضطرابی طور پر ایک قدم آگے بڑھ گیا۔

”خبردار!“ راجہ شمشیر سنگھ گرجا۔ ”اپنی جگہ سے حرکت مت کرو ورنہ اپنی موت کے ذمے دار خود ہوں گے۔ ذرا اپنے ارد گرد دیکھ لو!“

میں نے تیزی سے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر دم بخود رہ گیا۔

کمرے کے ہر دروازے پر ایک باوردی آفسر کھڑا ہوا تھا اور ان تمام آفسروں کے ہاتھوں میں ریوا لور تھے۔

ان ریوا لوروں کی نالیں میرے سینے کو تاک رہی تھی۔



میرا دم بخود رہ جانا ایک بیساختہ حرکت تھی لیکن میں ہر اس میں ہرگز نہیں تھا۔ وہ پچویش مجھے ذرا بھی خوفزدہ نہیں کر سکی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے خطرات سے کھیلنا میرے لیے کوئی نئی بات نہ رہی ہو اور میں ساری عمر مشکلات اور کٹھن حالات ہی سے کھیلتا رہا ہوں۔ جس طرح لوہا، آگ میں تپ کر فولاد بن جاتا ہے، اسی طرح میں بھی ایک ایسا مضبوط ستون بن چکا تھا جسے آسانی کے ساتھ اس کی جگہ سے نہیں ہلا جاسکتا تھا۔

میں نے بڑے غور سے راجہ شمشیر سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر مکمل اطمینان سے اپنی بات دہرائی۔ ”میں پھر عرض کرونگا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں ابھی آپ کی غلط فہمی رفع کر سکتا ہوں۔“

”بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو!“ شمشیر سنگھ گرجا: ”کل کی طرح آج میں تمہاری باتوں میں ہرگز نہیں آؤں گا۔“ اس سے پہلے کہ میں پھر کچھ کہتا دروازوں میں کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے دو شخص آگے بڑھ آئے راجہ شمشیر سنگھ نے انہیں کچھ اشارہ کیا تھا۔ ان دونوں سے ایک نے اپنا ریوالور جیب میں رکھ کر ہتھکڑیوں کا جوڑا نکالا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ ہتھکڑیاں میرے ہاتھوں میں ڈالی جاتیں اور مجھے کسی حقیر چوہے کی طرح بے بس کر لیا جاتا لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایک انتہائی نازک صورت حال تھی۔ میں اپنی انا کے شیشے کو چکنا چور ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سرکشی کی لہریں میرے وجود کو لپیٹ میں لے چکی تھیں اور راجہ شمشیر سنگھ کے تمام آدمی بڑی مستعدی سے ریوالور سنبھالے مجھ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔

ان دونوں آدمیوں میں سے ریوالور والا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا اور ہتھکڑیوں والا میرے بالکل قریب آیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

”مہاراج!“ میں نے شمشیر سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا: ”آپ ایک بار پھر سوچ لیں ورنہ.....“

”بکو اس بند کرو!“ ہتھکڑیوں والا گرجا۔

راجہ شمشیر سنگھ خاموش رہا تھا۔ میں نے سختی سے ہونٹ بھیجنے کر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ ہتھکڑیاں میری کلائیوں کی طرف بڑھیں تو مجھے یوں لگا جیسے میرا سارا جسم جھنجھٹا اٹھا ہو۔ میرے ضبط و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ یہ خیال ہی میرے لیے توہین آمیز تھا کہ دنیا کا بدنام ترین زیور میرے ہاتھوں میں پہنایا جائے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک انجانی سی آگ میرے جسم کو جلانے لگی ہو۔ بے پناہ جوش نے میرے ذہن کو اتنا گرمادیا کہ میں سوچے سمجھے بغیر وہ سب کچھ کر بیٹھا جو سوچ سمجھ کر تو شاید نہ کرتا۔

پھر جب چند لمحوں بعد میرا ذہن ٹھنڈا ہوا تو میں اپنی جوشیلی حرکتوں کا نتیجہ دیکھ کر بیساختہ ہنس پڑا۔ ہتھکڑیوں والا، ریوالور والے پر اوندھا پڑا ہوا، اپنا پیٹ پکڑے بری طرح ڈکرا رہا تھا اور ریوالور والا فرش پر چاروں خانے چپت، اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہو۔ ہتھکڑیاں چکنے فرش پر پھسلتی ہوئی بائیں جانب کی دیوار تک چلی گئی تھیں اور ریوالور؟ وہ میرے ہاتھ میں تھا اور اس کی نال راجہ شمشیر سنگھ کی پیٹھ سے لگی ہوئی تھی۔



دروازوں میں کھڑے ہوئے دوسرے آدمی اضطراری طور پر دو ایک قدم آگے تو بڑھ آئے تھے لیکن کچھ کرگزاران کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔ اگر وہ گولی چلاتے تو وہ میرے سینے تک پہنچنے سے پہلے راجہ شمشیر سنگھ کے سینے میں پیوست ہوتی۔ وہ بیچارے ہکا بکا سے کھڑے ہوئے تھے اور راجہ شمشیر سنگھ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

یہ سب کچھ کیسے ہو گیا.....؟ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ خود مجھے بھی احساس نہیں تھا کہ میں کیا کرگزار ہوں۔ میرا ذہن اس وقت گویا آندھیوں کی زد میں آیا ہوا تھا بس ایک دھندلے دھندلے سے خواب کی طرح مجھے یاد آ رہا تھا کہ جھکڑیوں والا شاید ایک لمحے کے لیے میرے جسم اور اپنے ساتھی کے ریوالور کے درمیان آ گیا تھا اور اس کی یہ چوک میرے کام آ گئی تھی میں نے جھکڑیوں والے کے پیٹ میں گھٹنا مار کر اسے ریوالور والے پر اچھال دیا تھا۔ ریوالور پر اس کی گرفت زیادہ مضبوط نہیں تھی اس لیے دھکا لگتے ہی ریوالور اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا اور میں نے ریوالور پر چھلانگ لگا دی تھی۔ ریوالور کو فرش سے سینٹا ہوا میں راجہ شمشیر سنگھ کی پشت پر پہنچ گیا تھا اور نال اس کی پیٹھ سے لگا دی تھی۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہو گیا تھا کہ دروازوں پر کھڑے ہوئے آدمی اس غیر متوقع دھما چوکڑی کو سمجھ ہی نہیں سکے تھے اور جب وہ سب کچھ سمجھنے کے بعد کوئی قدم اٹھانے کے قابل ہوئے تھے تو گویا محفل کا رنگ ہی بدل چکا تھا۔ صورت حال اب قطعی طور پر ان کے بس سے باہر تھی۔

میرا ذہن اس وقت بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ فی الحال تو صورت حال میرے قابو میں تھی لیکن میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس محل سے نکلنا میرے لیے امر محال ہی ثابت ہوگا۔ پلک جھپکتے میں میرے ذہن نے ایک تدبیر کو جنم دیا اور میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تدبیر یہ تھی کہ میں اس پھونشن کو پینڈل کرنے کے لیے انسانی نفسیات سے کھیلنے کی کوشش کروں۔

”مہاراج!“ میں نے آہستہ سے کہا: ”افسوس کے آپ نے مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اب ہوا کا رخ میری موافقت میں ہے لیکن میں اس سے کوئی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ خلوص نیت ثابت کرنے کے لیے میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرتا ہوں“ لیکن میں یہ درخواست ضرور کروں گا کہ میرے ہاتھوں میں جھکڑیاں لگانے کا توہین آمیز اقدام نہ کیا جائے۔“

میں راجہ شمشیر کی پشت سے ہٹ کر اس کے سامنے آ گیا میں نے ریوالور فرش پر پھینک دیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکی کہ میری اس ڈرامائی حرکت کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ راجہ شمشیر سنگھ کے چہرے کی سفیدی پر سرخی غالب آتی چلی گئی تھی اور خون کی جگہ الجھن کے آثار بیدار ہو گئے تھے۔ میرا وہ شاید اس کی سمجھ سے بالاتر تھا لیکن اب وہ میری نیت پر شبہ نہیں کر سکتا تھا اور مجھ پر اعتبار کرنے کے لیے نفسیاتی طور پر مجبور ہو گیا تھا۔

دروازوں پر کھڑے ہوئے آدمی متوقع نظروں سے راجہ شمشیر سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے! انہیں اس کے اگلے حکم کا انتظار تھا۔

”جاؤ!“ راجہ شمشیر سنگھ نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا: ”تم سب جاؤ“ میں تنہا ہی چاہتا ہوں۔“

میں نے بے اختیار ایک طویل سانس لی جو یقیناً اطمینان کی سانس تھی۔



ذرا سی دیر بعد ہم دونوں کمرے میں تنہا رہے گئے میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔

”نو جوان!“ راجہ شمشیر سنگھ دھیمی آواز میں بولا: ”میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہارے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے کل میں نے خود اپنی آنکھوں سے تمہیں کلدیپ کور کے ساتھ دیکھا تھا تم اسے لے کر گئے اور پھر میری بیٹی واپس نہیں لوٹی۔“ آخری فقرے کہتے ہوئے شمشیر سنگھ کی آواز کچھ بھرا گئی تھی۔ ایک باپ کے جذبات کو اس موقع پر امانڈا ہی چاہیے تھا۔

”مجھے آپ کے دکھ کا شدید احساس ہے مہاراج!“

میں نے کہا: ”مگر یقین کیجیے کہ میں کل یہاں نہیں آیا۔ کل تو میں یہاں سے سیکڑوں میل دور ایک ہسپتال میں پڑا ہوا تھا۔“

راجہ شمشیر سنگھ بڑی بے صبری سے میری بات کا ٹٹا ہوا بولا: ”میں بوڑھا ضرور ہو گیا ہوں لیکن ابھی میری آنکھیں اتنی کمزور نہیں ہوئیں کہ میں کسی کو قریب سے دیکھ کر بھی نہ پہچان سکوں۔“

”کل میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دیکھا تھا۔ تم سے باتیں بھی کی تھیں۔“

”یہ سب کچھ میرے لیے انتہائی حیرت انگیز ہے۔“ میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا: ”لیکن بہر حال میں یہ ثابت کروں گا کہ کل میں یہاں سے سیکڑوں میل دور تھا۔“

میں نے انٹیشن سے جو اخبار خریدا تھا وہ جیب سے نکال کر راجہ شمشیر سنگھ کی طرف بڑھا دیا اور بولا: ”میرے بارے میں خبر بھی چھپی ہے اور تصویر بھی۔ آپ میری تصویر کو غور سے دیکھیے۔“

راجہ شمشیر سنگھ نے جلدی جلدی سرخیوں پر نظر ڈالی اور پھر تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ تصویر کو دیکھتے ہوئے اس نے دو ایک بار میری طرف بھی دیکھا تھا۔ بالآخر وہ تھکے تھکے سے انداز میں ایک کرسی پر گر گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا: ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا عقل خط ہو کر رہ گئی ہے۔“

”بلاشبہ یہ ایسے ہی معاملات ہیں۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا: ”میرے دشمن بڑے پراسرار قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ میں تین مرتبہ ان کے قاتلانہ حملوں سے بچ چکا تھا اس لیے انہوں نے یہاں پر میرے لیے ایسا جال بنایا کہ میں بری طرح پھنس کر رہ جاؤں۔“

انہیں کسی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ادھر کا رخ کروں گا۔“

”کیا وہ لوگ جادوگر ہیں!“ شمشیر سنگھ نے بڑے عجیب سے لہجہ میں کہا۔

”فی الحال تو میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے غنڈی سانس لی۔ ”میرا ذہن بے شمار سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ میں اپنے ماضی کو فراموش کر چکا ہوں۔ میری شخصیت میرے ذہن کے اندھیروں میں گم ہے۔ میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ راجہ کماری صاحبہ سے مل

کر شاید میرے ذہن میں کچھ روشنی پھیل سکے مگر یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا ملا۔“

”اگر تم اپنے ماضی کو فراموش کر چکے ہو تو تمہیں کلدیب کا خیال کیسے آگیا؟“ راجہ شمشیر سنگھ کے لہجے میں شک و شبہ کی لہریں تھیں۔

میں مسکرا پڑا کیونکہ مجھے اس سوال کی توقع تھی میں نے شمشیر سنگھ کو وجہ بتائی۔ وہ وجہ حقیقت پر مبنی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ راجہ شمشیر سنگھ میری طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا۔ وہ نہ جانے کیا کہتے کہتے رکا تھا۔

”ہاں ہاں..... کہیے!“ میں نے اسے اکسایا۔

”میں تمہیں کس نام سے مخاطب کروں؟“

”اپالو۔“ میں کہتے ہوئے مسکرا پڑا۔ پھر اپنی انگلی میں پڑی ہوئی انگلی پر نظر ڈالتا ہوا بولا: ”میری انگلی پر ”اے“ بنا ہوا ہے۔ میرا نام اسی حرف سے شروع ہوتا ہوگا۔ لیکن میں اس سے بے خبر ہوں۔ ہسپتال کی ایک نرس نے اس حرف کی مناسبت سے مجھے اپالو کا نام دیا تھا۔ آپ بھی اگر چاہیں تو مجھے اسی نام سے پکار سکتے ہیں۔“

راجہ شمشیر چند لمحے خاموش رہا پھر بولا: ”نو جوان! میں ابھی تک تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں تحقیقات کروں گا۔ اس وقت تک تم میرے مہمان رہو گے۔ راج محل کی بیرونی چار دیواری سے نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ اس قسم کی کوئی حماقت تمہیں موت کی آغوش میں پہنچا دے گی کیونکہ میرے آدمی تم پر کڑی نظر رکھیں گے اور ان سب کو میرا یہ حکم مل چکا ہوگا کہ اگر تم فرار ہونے کی کوشش کرو تو تمہیں گولی مار دی جائے۔“

یہ صورت حال میرے لیے بڑی صبر آزمائی تھی۔ محل کی چار دیواری میں رہ کر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے نہ تو اپنے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھیں اور نہ میں اپنے دشمنوں کا پتا چلا سکتا تھا۔

”کیا آپ میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟“ میں اچانک راجہ شمشیر سنگھ سے وہ سوال کر بیٹھا جو کافی دیر سے میرے ذہن میں گلبلا رہا تھا۔

شمشیر سنگھ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر فوراً ہی بند کر لیا۔ اس نے اتنی سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے جیسے اس کو ڈر ہو کہ کوئی لفظ اس کے منہ سے نکل ہی نہ جائے۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر مجھے امید بندھی۔ میں جلدی سے بولا۔

”کیونکہ ماضی میں میری راج کمار صاحبہ سے واقفیت رہی ہے اس لیے عین ممکن ہے کہ آپ بھی میرے بارے میں کچھ جانتے ہوں اور.....“

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی راجہ شمشیر سنگھ نے دو مرتبہ تالی بجائی۔ فوراً ہی ایک باوردی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ راجہ



شمشیر سنگھ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے حکم دیا۔

”انہیں اس کمرے میں پہنچا دو جس میں راج محل کے خصوصی مہمان قیام کرتے ہیں۔ جب تک یہ یہاں رہیں گے، تم ان کی خدمت کے لیے وقف رہو گے۔“

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میں جلدی سے بولا۔

”اب میں تم سے کل صبح ملاقات کروں گا۔“ راجہ شمشیر سنگھ نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ ملاقات ختم! میں بے چین ہو گیا۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ راجہ شمشیر سنگھ کو میرے بارے میں کچھ نہ کچھ باتیں یقیناً معلوم ہیں لیکن وہ کسی وجہ سے انہیں فی الحال ضرور چھپانا چاہتا ہے۔

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا کیونکہ شمشیر سنگھ وہاں سے جا چکا تھا۔

ملازم نے مجھے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جسے نہایت پر تکلف انداز میں سجایا گیا تھا۔ یہ دراصل دو کمروں کا سوٹ تھا جس میں سے ایک کمرے کو نشست گاہ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔

میں تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر راجہ شمشیر سنگھ کو بھی میرے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہیں تو میں نے خود کو راج محل کے خطرات میں پھنسا کر کوئی برا سودا نہیں کیا۔ میں جلد یا بدیر راجہ شمشیر سنگھ کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو ہی جاتا۔

میرا ماضی میرے لیے ایک مستقل خلش بنا ہوا تھا جیسے کوئی کانٹا دل میں چبھ کر ٹوٹ گیا ہو میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کانٹا کب اور کیسے نکلے گا اور اسے کون نکالے گا۔ راجہ شمشیر سنگھ یا کلدیب کور؟..... فی الحال یہی دو نام میرے سامنے تھے جن کو میرے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم تھا۔

## چناروں کے آنسو

نوجوانوں کے پسندیدہ ترین مصنف طارق اسماعیل ساگر کا کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا پہلا ناول **چناروں کے آنسو**

کہانی ہے ایسے سر پھرے آزادی کے متوالے لوگوں کی جو اپنی حریت اور آزادی کی سانس کے بدلے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہیں۔ تحریک آزادی کشمیر اور ہندوستان میں سکھوں کے خالصتان کی تحریک کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول جلد ہی کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا۔

چناروں کے آنسو کو **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔



میرا ماضی مجھ سے اس بری طرح کٹ کر رہ گیا تھا کہ اس سے متعلق کوئی بات بھی مجھے یاد نہیں رہ گئی تھی۔ ہاں البتہ میرے ماضی سے متعلق دو چہرے ایسے ضرور تھے جن کو میرے شعور کی سطح نے اپنے اندر گویا جذب کر رکھا تھا۔ وہ دونوں چہرے میں نے کئی مرتبہ اپنے تصور میں دیکھے تھے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میرے ماضی میں ان کی حیثیت کیا تھی۔ ایک چہرہ تو منحوس شکل بوڑھے کا تھا جس کو دیکھ کر میرے رگ و پے میں نفرت کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں اور دوسرا ایک نسوانی چہرہ تھا۔ خوبصورت اور خوابناک.....! اسے تصور میں دیکھ کر میرے جذبات میں ہلچل سی مچ جاتی تھی۔ میرے بازو کسی کو بھیج لینے کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے۔ میں صاف صاف لکھ دینا چاہتا ہوں کہ اس چہرے کو دیکھ کر میرے جنسی جذبات کو تحریک ملتی تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ چہرہ راجکماری کلدیہ کور کا تو نہیں ہے؟ اس کی تصدیق یا تردید بڑی آسانی سے ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ راج محل میں کسی نہ کسی جگہ راجکماری کی کوئی تصویر ضرور لگی ہوئی ہوگی۔

تیسرے پہر تک میں اپنے منتشر خیالات میں الجھا رہا۔ اب میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اس درد سے نجات پانے کے لیے میں نے غسل کرنے کے بارے میں سوچا۔! اب میرے سر کا زخم غالباً بڑی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا کیونکہ مجھے تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بینڈج اتار پھینکی اور غسل خانے میں جا گھسا۔ ٹھنڈے پانی کا شاور میرے لیے بڑا سکون بخش ثابت ہوا۔ جب میں کپڑے پہن کر غسل خانے سے نکلا تو دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے!..... آ جاؤ!“ میں نے بہ آواز بلند کہا۔ دروازہ کھول کر وہی ملازم اندر آیا جسے راجہ شمشیر نے میری خدمت کے لیے وقف کیا تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی کہ سنگ روم میں سوشیلا کماری مجھ سے ملنے کے لیے بیٹھی ہیں۔

”سوشیلا کماری.....؟ یہ کون ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”راجکماری جی کی سہیلی ہیں۔“ ملازم نے جواب دیا۔

میں نے اس سے مزید استفسار کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جب میں دروازہ کھول کر سنگ روم میں داخل ہوا تو وہ سامنے بیٹھی دکھائی دی۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ دھانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ میری نظروں نے اس کے گدرائے ہوئے بدن کو محسوس کیا تو ذہن میں سنسناء ہٹنے لگی۔ ایک دم سے میرے تصور کے پردے پر وہی نسوانی چہرہ آیا جو میرے جذبات کا محرک ثابت ہوتا تھا۔ میں نے اپنے جذبات کے اشتعال کو قابو میں کرنے کی کوشش کی اور بڑھ کر بڑی نرم آواز میں بولا: ”فرمائیے!“

وہ میری پیشوائی کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مجھ سے نظریں چار کرنے کی کوشش کی لیکن پھر جلدی سے سر جھکا لیا اور لرزتی ہوئی سی آواز میں بولی: ”میں راجکماری کلدیہ کور کی سہیلی ہوں۔ میرا نام سوشیلا ہے اور میں یہیں راج محل کے قریب بڑی حویلی میں رہتی ہوں۔“



”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ تشریف رکھیے۔!“

ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میری نظریں بھی اس کے پیروں کی طرف اٹھ گئیں۔ سینڈل کے اگلے حصے سے جھانکتی ہوئی گوری گوری انگلیوں کا گداز میرے دل میں ہلچل مچانے لگا۔

سوشیلا آہستہ سے بولی: ”مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے ہیں اور آپ کا قیام راج محل میں ہے لہذا میں دوڑی چلی

آئی۔“

”مجھ سے ملنے کی یقیناً کوئی خاص وجہ ہوگی۔؟“ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے شہابی رنگ کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”جی..... جی ہاں..... دراصل کل دیوبند کورس سے آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا رہا ہے۔“

”اوہ!“ یکبارگی میرا دل اس خیال سے دھڑک اٹھا کہ سوشیلا سے مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔

”میں آپ سے ملنے کی خواہش مند تھی۔“ سوشیلا نے کہا۔

”کیوں..... میرا مطلب ہے..... کیا کوئی خاص وجہ؟“

”جی..... جی نہیں..... کوئی خاص وجہ تو نہیں..... یونہی..... جی چاہا اور میں چلی آئی۔“

”دیوبند جی آپ ہندو ناری ہیں۔ اپنے الفاظ پر غور کر لیں۔“ میرے لہجے میں شوخی عود کر آئی تھی جسے محسوس کر کے سوشیلا کا گورا

گورا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ جھپینے ہوئے سے انداز میں بولی۔

”میرے پتا جی فری تھنکر ہیں۔ مجھے گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی ہے۔ میں جب اور جہاں چاہوں آ جا سکتی ہوں۔ کل دیوبند

سے آپ کے بارے میں سن سن کر مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ کل بھی جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے ہیں تو میں دوڑی چلی

آئی تھی۔“

”تو پھر آپ نے مجھے کل بھی دیکھا ہوگا۔؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”نہیں وہ تو کوئی اور تھا۔“ سوشیلا کماری نے بیساختہ جواب دیا اور پھر یلکھت اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ ایسا کیا ہوا تھا

جیسے وہ یہ جواب دینا تو نہ چاہتی ہو لیکن بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا ہو۔

ادھر میں اس کا یہ جواب سن کر چونک پڑا تھا۔ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ سوشیلا کے بیان کے مطابق وہ میں نہیں تھا جبکہ راجہ

شمشیر سنگھ نے یہ بات بڑے دعوے سے کہی تھی کہ اس کی آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں اور وہ میں ہی تھا جو کل دیوبند کور کو اغوا کر لے گیا۔

سوشیلا کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اچانک وہ گھبرائے ہوئے انداز میں کھڑی ہو گئی اور جب وہ بولی تو اس کے

لہجے میں خفیف سی تھرتھراہٹ تھی۔

”میں نے جو کچھ کہا اسے بھول جائیے۔ میں بعض اوقات غیر ارادی طور پر بڑی بے تکلی باتیں کر جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے

خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی سانس بڑی تیزی سے آ جا رہی تھی اور سینے کا تھوچ قیامت ڈھا رہا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بڑی محبت سے تھپتھپانے لگا۔ پھر بڑے نرم لہجے میں بولا: ”گھبراؤ مت سوشیلا ہم یہاں اکیلے ہیں۔ کوئی ہماری باتیں نہیں سن سکتا اور میں تمہیں اس بات کا بھی یقین دلاتا ہوں کہ راجہ شمشیر سنگھ کو میں تم سے معلوم ہونے والی باتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

سوشیلا نے آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں سے کھینچ لیا اور بولی: ”کیا آپ ٹینس کھیلنا جانتے ہیں؟“ مجھے اس بے نکتے سوال پر بڑی حیرت ہوئی لیکن میں نے جواب دے دیا۔

”ہاں ہاں..... شاید میں کھیل سکتا ہوں۔“

”تو پھر ذرا دیر بعد ٹینس کورٹ پر آ جائیے گا۔ وہیں باتیں ہوں گی۔ یہاں مناسب نہیں ہے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے مڑی اور ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی میں کھڑا کھڑا رہ گیا۔ میرا ذہن بہت بری طرح الجھا ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ٹینس کورٹ کہاں ہے جہاں سوشیلا نے مجھے بلایا تھا۔ یہ بات اندازے ہی سے سمجھی جاسکتی تھی کہ وہ راج محل کے کسی حصے میں ہوگا۔

میں نے ملازم کو بلا کر اس سے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ راج محل کے باغات اور میدانوں میں کئی قسم کے کھیلوں کا انتظام تھا۔ جب میں نے ٹینس کھیلنے کی خواہش ظاہر کی تو ملازم میرے لیے ریکٹ اور کٹ کا انتظام کرنے چلا گیا۔ میں سینٹگ روم میں ہی بیٹھا رہا۔ سینئر ٹیبل پر ایک خوبصورت سگریٹ کیس رکھا ہوا تھا جس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور اس کے ہلکے ہلکے کش لیتا ہوا ان بدلے ہوئے حالات پر غور کرنے لگا۔

راجہ شمشیر سنگھ اور سوشیلا کماری کے بیان میں تضاد تھا۔ بظاہر یہ بات ناممکن تھی کہ وہ دونوں ہی سچ بول رہے ہوں۔ ان میں سے ایک یقیناً جھوٹا تھا۔ مگر کون؟..... سوشیلا کماری یا راجہ شمشیر سنگھ؟

نہ جانے کیوں میرا دل و دماغ سوشیلا کماری کو جھوٹا سمجھنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن الجھن یہ بھی تھی کہ راجہ شمشیر سنگھ نے یہ جھوٹ کیوں بولا۔ کیا وہ بھی میرے خلاف کوئی سازش کرنا چاہتا تھا یا میرے دشمن اسے اپنے ساتھ ملا چکے تھے.....! میں نے ان باتوں پر جتنا غور کیا اتنا ہی میرا ذہن الجھتا چلا گیا۔ ویسے مجھے یہ امید ضرور بندھ گئی تھی کہ بہت جلد میری الجھنیں رفع ہو جائیں گی۔ میرا یہ سوچنا غلط نہیں تھا کہ ٹینس کورٹ پر سوشیلا سے گفتگو کے دوران، سنسنی خیز انکشافات ہوں گے اور غالباً یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہو۔

میں اپنی سوچ کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ ملازم آ گیا۔ وہ ریکٹ اور کٹ لے کر آیا تھا۔ میں اسی کی رہنمائی میں ٹینس کورٹ تک پہنچا۔



گھاس کے چار خوشنلان، ٹینس کے لیے مخصوص تھے۔ میں نے وہاں دو تین جوڑوں کو کھیل میں مشغول دیکھا مگر ان میں سوشیلا نہیں تھی۔

میں ایک خالی کورٹ پر جم گیا۔ فوراً ہی دو تین بال بوائے کورٹ پر آ گئے۔ شاید وہ اسی کورٹ کے لیے مخصوص تھے۔ انہوں نے گیندیں فراہم کیں اور میں انہیں اچھال کر ریکٹ سے مارنے لگا۔ غالباً میں جلدی اس مشغلے سے اکتا جاتا مگر چند منٹ بعد ہی سوشیلا آ گئی۔ چند لمحوں کے لیے رُک کر اس نے دوسرے کورٹ پر کھیلنے والوں سے چند باتیں کیں، ان کا کھیل دیکھا اور پھر قدرے تکلف کے سے انداز میں میری طرف آئی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے ہیلو کہا اور کھیلنے کی دعوت دی۔ انداز ایسا اختیار کیا تھا جیسے یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت نہ ہو۔

سوشیلا نے بھی ایسے ہی انداز میں میری دعوت قبول کی تھی جیسے کوئی اور کورٹ خالی نہ ہونے اور کسی شناسا ساتھی کی عدم موجودگی کے باعث میرے ساتھ کھیلنے پر مجبور ہو۔

لیکن جب کھیل شروع ہوا تو آہستہ آہستہ تکلف کی دیوار گرتی چلی گئی۔ ہم ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے لیکن ظاہر ہے کہ وہ باتیں کسی خاص موضوع پر نہیں ہو سکتی تھیں۔

سوشیلا کھیل کے مخصوص لباس میں بے حد دلکش نظر آ رہی تھی۔ اتنی پرکشش کہ میں کھیل پر دھیان نہیں دے سکا۔ اس کی جسمانی حرکات میرے جذبات میں ہلچل مچا رہی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ میں چند ہی سیٹ کھیل کر بور ہو گیا۔ میری عدم توجہی کے باعث وہ بھی اکتا گئی اور ہم کھیل ختم کر کے کورٹ کے کنارے گھاس پر گر گئے۔ انداز ایسا تھا جیسے بہت تھک گئے ہوں۔

سوشیلا بار بار ہنس رہی تھی اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میرے جذبات برا بیختے ہوتے جا رہے تھے اور میں بالکل بھول گیا تھا کہ ہم وہاں کیوں اکٹھا ہوئے تھے لیکن سوشیلا نہیں بھولی تھی۔ اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ نے محسوس نہیں کیا کہ راجہ شمشیر سنگھ کے آدمی آپ کی نگرانی کر رہے ہیں۔؟“

میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ تو مجھے کورٹ پر پہنچتے ہی محسوس ہو گیا تھا کہ راجہ کے باوردی اور سادہ لباس ملازمین ٹینس کورٹ کے چکر لگا رہے تھے اور ان کی توجہ بظاہر میری طرف نہ ہونے کے باوجود بھی میری ہی طرف تھی لیکن میں اس کی وجہ سے کسی تشویش یا پریشانی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ راجہ شمشیر سنگھ نے خود ہی یہ بات مجھ سے کہہ دی تھی کہ وہ میری طرف سے مطمئن نہیں ہوا ہے لہذا اس کے آدمی مجھ پر کڑی نظر رکھیں گے۔

میں سوشیلا سے کہا: ”مگر تم کو ان کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہمارے قریب آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔“

”یہ تو میں سمجھتی ہوں۔ اسی لیے میں نے آپ کو یہاں بلایا تھا۔“ سوشیلا نے کہا اور یوں ہنس پڑی جیسے کسی بہت دلچسپ موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو۔ وہ یقیناً بہت ذہین لڑکی تھی۔ اس کی اس قسم کی حرکتوں کی بناء پر نگرانی کرنے والوں کو یہ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم یہاں کسی

سجیدہ موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے کہا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا تھا کہ وہ اپنا ہاتھ کھینچ لے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید اس نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اس کے گداز ہاتھ کا لمس میرے جذباتی ہيجان میں اضافہ کرتا رہا۔ ویسے مجھے اپنی اس افتاد طبع پر حیرت بھی تھی۔ ان حالات میں جبکہ خطرات نے مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے، مجھے اس قسم کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہونا چاہیے تھی لیکن شاید میرا خمیر حسن و عشق ہی سے اٹھا تھا۔

”میں کلدیہ کی طرف سے پریشان ہوں اور اس کے بارے میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ سوشیلا کہہ رہی تھی۔

میں یکھنت چونک کر ہيجانی جذبات کی دنیا سے نکل آیا تھا۔ مجھے اس وقت اپنے اوپر قابو پالینا چاہیے تھا کتنی ہی باتیں تھیں جو مجھے سوشیلا سے کرنی تھیں۔ کئی اہم سوالوں کے جواب مجھے اس سے ملنا تھے اور ایک امید موہوم یہ بھی تھی کہ شاید وہ کوئی ایسی بات بتا سکے جو میری شخصیت کو روشنی میں لے آئے۔

سوشیلا بولی: ”لیکن پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اخبارات میں آپ کے بارے جو کچھ شائع ہوا ہے، کیا وہ.....“  
 ”وہ حقیقت پر مبنی ہے سوشیلا!“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ماضی کو فراموش کر چکا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔“

”تو پھر آپ راج محل تک کیسے پہنچ گئے؟ جب آپ اپنے ماضی کو فراموش کر چکے ہیں تو پھر کلدیہ کو کون بھی آپ کے ذہن سے نکل جانا چاہیے تھا۔“

”وہ واقعی میرے ذہن میں نہیں تھی۔ دراصل مجھے اپنی جیب میں کاغذ کا ایک پرزہ مل گیا تھا جو کسی ٹیلیگرام کا ایک حصہ تھا۔“ میں نے سوشیلا کو اس کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور پھر کہا۔ ”اسی لیے مجھے زنجن پور آنے کی سوجھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔“

”ہوں۔“ سوشیلا سر ہلانے لگی۔

”کیا اب بھی تم کو میرے بیان پر شبہ ہے؟“

”نہیں۔“ سوشیلا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: ”راجماری نے وہ ٹیلیگرام میرے ہی ذریعے سے آپ کو بھجوا دیا تھا۔“

”اوہ!“ یکبارگی میرا دل دھڑک اٹھا۔ ”اس پر میرا پتا تو یقیناً لکھا ہوگا۔“

”ظاہر ہے۔“

”وہ کیا تھا؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔



”مجھے اس کا علم نہیں۔ دراصل تارکا فارم کلدیب کور نے خود بھرا تھا۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ اسے ڈاک خانے تک پہنچا دوں۔ یہ کام سرانجام دیتے ہوئے میں نے اس پر لکھے ہوئے پتے پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ ویسے ڈاک خانے سے اس کا پتا چلایا جاسکتا ہے۔ ٹیلیگرام چونکہ راج کماری کی طرف سے تھا اس لیے ڈاک والوں نے اس کی تفصیلات کو اہمیت دی ہوگی اور اس کا باقاعدہ اندراج کیا ہوگا۔“

میں نے سر ہلایا اور پھر بولا: ”یہ بھی تو ممکن ہے کہ راج کماری نے اپنی ڈائری میں میرا نام اور پتا لکھا ہو۔“

”امکان تو ہے۔“

”تمہیں کم از کم میرا نام تو معلوم ہوگا۔!“

”ظاہر ہے۔“ سوشیلا نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں۔

”وہ کیا ہے سوشیلا! وہ کیا ہے! مجھے بتاؤ!“ میں نے قدرے جوش میں آکر اس کا ہاتھ دبا دیا۔

وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے بولی: ”کنور پر تاب سنگھ۔“

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا کیونکہ میں اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میری انگوٹھی پر بنے ہوئے ”اے“ سے یہ بات ثابت تھی کہ میرا نام پر تاب نہیں ہو سکتا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر سوشیلا نے کہا: ”اب جبکہ مجھے آپ کی یادداشت کی گمشدگی پر کوئی شبہ نہیں رہا، میں آپ کو بتاؤں گی کہ پوری طرح چوکنا رہیے۔ راج محل میں آپ کے گرد کسی سازش کا جال بنا جا رہا ہے۔“

”سازش؟ راج محل میں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”جی ہاں..... اور مجھے شبہ ہے کہ ان لوگوں نے کلدیب کور کا سہارا لے کر آپ کو پھانسا ہے۔ وہ آپ سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور شاید اسی چکر میں پڑ کر ماری گئی۔“

## دوسری فصل

اکثر خواب سچے ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو نیند میں اس کی بھولے ہوئے ماضی بلکہ مستقبل کی تصویر بھی دکھاتے ہیں۔ خواب میں وہ ماضی میں گم شدہ اپنی شخصیت کی شناخت بھی کر سکتا ہے۔ قدرت کبھی کبھی انسان کو ایسے موقع فراہم کرتی ہے۔ علیم الحق حقی نے ایک بار پھر ایک نہایت منفرد موضوع پر قلم اٹھایا اور تخلیق پائی یہ کہانی..... دوسری فصل، جسکی بنیاد ہندوؤں کے عقیدہ آواگون (دوسرا جنم) پر رکھی گئی ہے۔ ناول

دوسری فصل کو ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”یہ آپ کی یادداشت کا قصور ہے ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ کلدیہ کور نے آپ کو فوراً کیوں بلایا تھا اور آپ کلدیہ کور سے کیوں لڑے تھے۔“

”اب تم ہی یہ سب کچھ بتا دو سوشیلا!“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ”مجھے تو یہ ڈر ہے کہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی نیس نہ پھٹ جائیں۔ میں خود کو ایک لامحدود خلا میں بے بسی سے ہاتھ پر پھینکتا محسوس کر رہا ہوں مجھے اپنی شخصیت کے گرد پھیلے ہوئے سناٹے میں کسی بھی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ میں اس سناٹے سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ کلدیہ کور نے مجھے کیوں بلایا تھا۔“

سوشیلا نظریں جھکا کر اپنے ناخن کریدنے لگی۔ نہ جانے اسے کیا خیال آ گیا تھا کہ اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شرم کی سرخی تھی۔ میں تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے سوشیلا! تم ایک دم چپ کیوں ہو گئیں؟“

سوشیلا نے نظریں اٹھائیں اور پھر معنی خیز انداز میں بولی۔ ”کیا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ جب کوئی نوجوان لڑکی گھبراہٹ میں مبتلا ہو جائے اور اپنی مدد کے لیے کسی نوجوان کو بلائے تو اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔؟“

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور پھر انکار میں سر ہلانے لگا۔

آخر سوشیلا نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ تقریباً ڈیڑھ دو ماہ قبل کی بات ہے۔ دارالحکومت میں راجہ شمشیر سنگھ کے ایک دوست کی لڑکی کی شادی تھی۔ کلدیہ کور اور مہاراج اس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اسی تقریب میں کلدیہ کور آپ سے ملی تھی۔ اس پہلی ملاقات میں اس نے اپنا دل بار دیا تھا۔ آپ بھی پارٹی میں شریک ہونے والی دوسری لڑکیوں کو نظر انداز کر کے صرف کلدیہ کور کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ ناچ رنگ اور مدہوشی کی اس فضا میں آپ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے۔ اتنے قریب کہ..... کہ.....“ سوشیلا کی زبان لڑکھڑائی۔ چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔ وہ قدرے توقف سے ہمت کر کے پھر بولی۔ ”وہاں سے لوٹنے کے کچھ دن بعد ہی راجہ شمشیر سنگھ کو محسوس ہو گیا کہ آپ دونوں کی قربت رنگ لاپچی ہے۔ اس نے آپ سے خط و کتابت کی اور پھر گھبرا کر ایک ٹیلیگرام بھی دے دیا۔“

ساری بات اب میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ میرے سامان و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس قسم کی کوئی بات ہو سکتی ہے۔

میں چند لمحے بعد آہستہ سے بولا: ”تم نے یہ نہیں بتایا کہ راجہ شمشیر سنگھ کیوں ہوا تھا۔“

”راجہ شمشیر سنگھ کو آپ کی نشانی بہت عزیز تھی لیکن آپ چاہتے تھے کہ اسے ضائع کر دیا جائے ویسے آپ راجہ شمشیر سنگھ کے لیے تیار تھے۔ جب آپ ٹیلیگرام ملنے کے بعد یہاں آئے تھے اس روز مہاراج یہاں نہیں تھے۔ کسی کام سے ریاست سے باہر گئے ہوئے تھے۔“



میں راجکاری سے ملنے آئی تھی لیکن ملی نہیں۔ آپ دونوں کو لڑتا جھگڑتا دیکھ کر اُلٹے پاؤں واپس لوٹ گئی تھی۔ میں نے کلدیب کو روتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ جلد ہی دوبارہ آئیں گے۔ آپ اس سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ وہ تیار رہے تاکہ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور..... اور..... معاملہ صاف کرادیں۔“ سوشیلا کی زبان پھر لڑکھڑانے لگی۔

”تو کیا کلدیب نے نشانی کو محفوظ رکھنے کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں..... کلدیب کو یہ ڈر بھی تھا کہ بات مہاراج تک ضرور پہنچے گی لیکن وہ ہر حال میں اپنے موقف پر ڈٹی رہنا چاہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کا خدشہ ٹھیک ہی نکلا تھا۔ مہاراج کو وہ بات معلوم ہوگئی تھی۔ چونکہ مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا اس لیے کل آپ کی آمد کی خبر سن کر دوڑی چلی آئی تھی مگر کل میں نے جو ڈراما دیکھا اس نے میرے ہوش اڑا دیے۔“

سوشیلا کی باتیں میرے اضطراب میں اضافہ کرتی چلی جا رہی تھیں اور میں چاہتا تھا کہ وہ مسلسل بولتی رہے اور جلد از جلد مجھے سب کچھ بتا دے ایک لمبی سانس لے کر سوشیلا نے پھر بولنا شروع کیا۔

”میں یہاں پہنچی تو بڑے کمرے میں مہاراج کی گرجدار آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ کلدیب کا راز طشت از بام ہو گیا ہے اور مہاراج توقع کے مطابق ہر دو فریق پر گرج برس رہے ہیں۔ ان حالات میں مجھے اندر جانے کی ہمت تو نہ ہو سکی لیکن میں اپنے تجسس سے مجبور ہو کر ایک کھڑکی سے کمرے میں جھانکنے لگی۔ دراصل مجھے یہ اطمینان تھا کہ اگر مجھے کھڑکی سے جھانٹتے ہوئے دیکھ لیا گیا تو بھی مہاراج مجھے معمولی سی سرزنش کر کے چھوڑ دیں گے کیونکہ وہ پتاجی کی بہت عزت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مجھ سے بھی ان کا سلوک مشفقانہ ہی رہا ہے۔“

”تم نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو تمہیں کیا نظر آیا؟“ میں نے پتاجی سے پوچھا۔

”کلدیہ کو ریٹھی ہوئی رو رہی تھی اور ایک منحوس شکل بوڑھا اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ مہاراج ان دونوں پر گرج برس رہے تھے۔“

”اور میں کیا کر رہا تھا؟“

”آپ وہاں موجود نہیں تھے لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کلدیب نے اس بوڑھے کو آپ کا نام لے کر مخاطب کیا۔“

”کیا!“ میں اچھل پڑا۔

”جی ہاں۔“ سوشیلا نے کہا۔ ”کلدیہ نے اس بوڑھے کو مخاطب کر کے کہا پرتاب! میں ہر قیمت پر تمہارے ساتھ چلوں گی خواہ پتاجی اس بات کو پسند کریں یا نہ کریں اور خواہ آپ کی نشانی رہے یا نہ رہے۔“

میں حیرت سے منہ پھاڑے سوشیلا کی طرف دیکھتا رہا۔

ان باتوں نے مجھے بری طرح چکرا دیا تھا۔

سوشیلا کہتی رہی۔ ”خود وہ بوڑھا بھی اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے وہ کنور پر تاب سنگھ ہو۔ وہ کل دیب سے کہہ رہا تھا کہ اب اس کے خیالات بدل گئے ہیں اور وہ بچے کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتا جبکہ مہاراج اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اس بچے کو ضائع ہو جانا ہی بہتر ہے۔ بلکہ ارغضروری! خیالات کے اس تضاد کے بناء پر مہاراج اور اس بوڑھے کے درمیان تلخ کلامی ہو رہی تھی لیکن پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ مہاراج ایک دم خاموش ہو گئے۔ وہ خاموشی سے بوڑھے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے اور بوڑھا کل دیب کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اس نے مہاراج سے جانے کی اجازت مانگی جو اسے فوراً مل گئی۔ میں تو مہاراج کے اس رویے پر بھونچکا سی رہ گئی تھی۔“

”مہاراج نے اچانک ہار کیوں مان لی؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مہاراج بڑے ضدی آدمی ہیں مگر نہ جانے کیسے وہ اچانک ہی اس بوڑھے کے سامنے بھیگی بلی بن کر رہ گئے تھے۔“

مجھے ایک دم اس بوڑھے کے چہرے کا خیال آیا جو میں دو ایک بار اپنے تصور میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے سوشیلا سے کہا۔ ”اس بوڑھے کا حلیہ کیا تھا؟“

سوشیلا نے جو حلیہ بتایا وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ حالات اب بہت ہی زیادہ پیچیدہ نظر آنے لگے تھے۔ ان الجھاؤوں کو سلجھانا بہت ہی مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ میں ذرا دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا پھر سوشیلا سے بولا۔

”تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ راج محل میں میرے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔“

”مہاراج اور کل دیب کور، دونوں ہی اس بوڑھے کو کنور پر تاب سنگھ کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ آخر ایسا کیوں تھا؟“

”تو کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ کل دیب کور بھی میرے خلاف ہونے والی سازش میں شریک ہے؟“

”میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا سمجھوں!“ سوشیلا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ سب کچھ میرے لیے بہت عجیب تھا۔ منجوس بوڑھا میری پیاری سہیلی کو لے کر چلا گیا اور مہاراج خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر ان دونوں کے جانے کے بعد اچانک مہاراج نے چیخنا شروع کر دیا۔ راج محل کے محافظ چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ مہاراج کی ہدایت پر انہوں نے ہر طرف راجکماری کو ڈھونڈا لیکن کچھ پتا نہیں چلا سکا۔ وہ اور بوڑھا اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ پھانک پر متعین پہرے داروں کا بیان ہے کہ انہوں نے راجکماری کو کسی کے ساتھ وہاں سے نکلنے نہیں دیکھا۔“

”مہاراج کے اس رویے سے تم نے کوئی نتیجہ اخذ کیا؟“

”کیا آپ ان حالات سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں؟“

”نہیں۔“



”تو پھر میں کیسے کر لیتی۔“

”ہوں۔“ میں چپ ہو کر سوچنے لگا۔

سوشیلا کچھ دیر بعد بولی۔ ”مہاراج نے صوبائی پولیس کو اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی ہے۔ بس اپنے ایک خاص آدمی کو اس معاملے کی تحقیق و تفتیش پر مقرر کیا ہے۔ وہ کل ہی راج محل سے غائب ہو گیا تھا۔ جب وہ لوٹے گا تو مجھے یقین ہے کہ آپ سے اچھی طرح پیش نہیں آئے گا۔“

”کیوں!“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

لیکن سوشیلا کو جواب دینے کی مہلت نہیں مل سکی۔ ہم اس گفتگو کی ابتدا میں تو بہت محتاط رہے تھے لیکن پھر اس بری طرح الجھے کہ ارد گرد کے ماحول کی خبر ہی نہ رہی۔ پھر ہم اس وقت چونکے جب ایک بھاری بھر کم آواز ہمارے سروں پر گونجی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

سوشیلا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ جلدی سے اپنے کپڑے درست کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بڑے اطمینان سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس اجنبی کا جائزہ لینے لگا جو ہمارے سروں پر کھڑا ہوا تھا پینتیس چھتیس سال کا وہ آدمی اپنے لہجے ہی کی طرح بھاری بھر کم واقع ہوا تھا۔

”کیا تم لوگوں نے سنا نہیں؟“ وہ پھر گرجا۔ ”میں نے پوچھا تھا یہاں کیا ہو رہا ہے۔!“

”اگر تمیز سے سوال دہراؤ تو شاید میں جواب دینے کے بارے میں سوچ سکوں!“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

اس وقت سورج کی روشنی مضحل ہو چکی تھی۔ دن ڈھل رہا تھا۔ ملگجی سی روشنی میں مجھے نووارد اجنبی کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ دکھائی دی۔

”پر تاب سنگھ!“ وہ پہلے ہی کے سے لہجے میں بولا۔ ”میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم نے دوبارہ یہاں آنے کی حماقت کیسے کی۔ لیکن اب تم آہی گئے ہو تو تمہیں بتانا پڑے گا کہ راجکاری صاحبہ کہاں ہیں۔!“

میں نے غور سے اس کی کینہ توڑ آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی توہین آمیز مسکراہٹ میرے تن بدن میں آگ لگا رہی تھی لیکن میں نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

”میں بد تمیزوں کو منہ نہیں لگاتا۔ بات کرنا ہے تو تمیز سیکھ کر آؤ۔!“

میں سوشیلا کی طرف مڑا جو زمین پر نظریں گاڑے خاموش بیٹھی لرز رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تمہیں میرے سوالوں کا جواب دینا ہی پڑے گا۔ سمجھے!“ اجنبی نووارد غرایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ بڑے زور

سے میرے کندھے پر رکھا۔

اب میری برداشت جواب دے گئی اور میں بڑی تیزی سے پلٹا میرے سیدھے ہاتھ کا گھونسا اجنبی کے جڑے پر پڑا۔ وہ کمزور تو نہیں تھا لیکن میری یہ حرکت اس کے لیے غیر متوقع ہی رہی ہوگی۔ ویسے بھی میں نے اپنے جسم کی تمام تر قوت اپنے گھونسنے میں سودینے کی کوشش کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اجنبی کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دوسری طرف الٹ گیا۔

”کنور! کنور!“ سوشیلا چیختی۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ مہاراج کے دست راست ہیں۔“

لیکن مجھے اس کی یہ وارنگ بہت دیر سے ملی تھی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اور جو کچھ میں کر گزرتا تھا اس پر پچھتانا میری فطرت نہیں تھی۔ ویسے میں راجہ شمشیر سنگھ سے بھی مرعوب نہیں ہوا تھا لہذا اس کے دست راست کی میری نظروں میں کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔

میں نے لا پرواہی سے شانے اچکا کر کہا۔ ”بد تمیزوں کو سبق دینا ضروری ہوتا ہے، خواہ وہ راجہ مہاراجہ ہی کیوں نہ ہوں۔“ اس اثنا میں اجنبی خون تھوکتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے گھورتا ہوا بڑے زہریلے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔“

”مہنگے سودے کرنا میری ہابی ہے، تم پروامت کرو!“ میں نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

”اور تم! اجنبی سوشیلا کی طرف مڑتا ہوا غرایا۔“ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت ہاتھ پیر نکال رہی ہو۔ تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ اس شخص سے دور دور رہو ورنہ مجھے اس سلسلے میں تمہارے باپ سے گفتگو کرنا پڑے گی۔“

سوشیلا کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں سکی۔ اجنبی ہاتھ جھلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی برابر کے کورٹ نہ جانے کب کے خالی ہو چکے تھے۔ میری اور اس اجنبی کی جھڑپ کسی نے نہیں دیکھی تھی۔

”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا کنور!“ سوشیلا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ تو پہلے ہی آپ کا دشمن تھا۔ اب آپ نے اسے دشمن جانی بنا لیا ہے۔ اس کا نام بلونت ہے اور وہ بڑا کینہ پرور شخص ہے۔“

میں نے کچھ دیر پہلے اسی کا تذکرہ کیا تھا۔ راج محل کا کرتا دھرتا یہی شخص ہے۔ مہاراج کے عزیزوں میں سے ہے اور کلدیب کور سے شادی کرنا اس کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ ایسی صورت میں آپ کے بارے میں اس کے جذبات کیا ہوں گے؟ اس کا اندازہ آپ آسانی سے لگا سکتے ہیں۔“

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ سوشیلا بہت خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ ممکن ہے وہ ہمیشہ ہی بلونت سے خوفزدہ رہتی ہو۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔“ سوشیلا نے کہا اور تیزی سے ایک طرف بڑھتی چلی گئی۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا تھا کہ آگے بڑھ کر اسے روک لوں لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور محل کی طرف چل



پڑا اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے ملازم سے کافی کے لیے کہا اور سیٹنگ روم ہی ایک کرسی پر گرا آنکھیں بند کر لیں۔ اب مجھے دیکھنا یہ تھا کہ بلونت میرے خلاف کیا قدم اٹھاتا ہے۔

اندھیرا پھیل چکا تھا اس لیے ملازم نے کافی لینے کے لیے جانے سے پہلے کمرے کی لائٹ جلا دی۔

میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور سوشیلا کی باتیں میرے ذہن میں چکراتی رہیں۔ اس سے گفتگو کر کے میری الجھنیں دور ہو گئی تھیں لیکن دوسرے کئی الجھاوے پیدا ہو گئے تھے۔ میں یہ تو جان گیا تھا کہ ماضی میں کلہاڑی کور سے میرے تعلقات کی نوعیت کیا تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے اپنا نام پر تاب سنگھ کیوں بتایا تھا۔ اگر میرا یہی نام تھا تو پھر یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ میری انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی میری نہیں تھی۔ گویا یہ ایک اور الجھاو تھا کہ کسی اور کی انگوٹھی میرے ہاتھ میں کیوں اور کیسے آ گئی۔

میں نے اس الجھاوے کو نظر انداز کر کے یہ سوچنا شروع کیا کہ کیا واقعی میرا تعلق سکھ مذہب سے ہو سکتا ہے؟..... مجھے اس مذہب سے اپنا تعلق کچھ خوشگوار نہیں معلوم ہوا لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ سکھ مذہب کے بارے میں میری معلومات خاصی وسیع ہیں۔ ذہن پر کچھ اور زور ڈالا تو پتا چلا کہ سکھ مذہب ہی پر منحصر نہیں بلکہ دنیا کے متعدد مذاہب کے بارے میں مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ ان میں ایسے مذاہب بھی تھے جن کو مردہ سمجھا جا چکا ہے اور جن کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ اب ان کو ماننے والے دنیا کے کسی گوشے میں نہیں پائے جاتے۔

تمام مذاہب کے آغاز و ارتقا کی مکمل تاریخ میرے ذہن میں پھیلی ہوئی تھی اور میں اپنی ان معلومات پر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ہی دیوار پر ایک کیلنڈر لٹکا ہوا تھا اور کھڑکی سے آنے والی ہوا کے باعث اس کے اوراق پھڑ پھڑا رہے تھے۔ مجھے اس وقت وہ آواز بہت بری معلوم ہو رہی تھی لیکن میرا جسم اتنا تھکا ہوا تھا کہ میں کیلنڈر کو دیوار سے اتار دینے کے لیے کرسی سے اٹھنے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ میری نظریں کیلنڈر پر جمی رہی ہیں اور اس وقت میرے دل میں یہ ہچکناہی خواہش پیدا ہوئی کہ کیلنڈر کی ڈوری ٹوٹ جائے اور وہ فرش پر گر پڑے۔ یہ سوچتے ہوئے میری نظریں دیوار کی جڑ میں فرش کی طرف گئیں اور پھر دوسرے ہی لمحے میں بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا کیونکہ میری فرش کی طرف جھکتی ہوئی نظروں کے ساتھ ہی کیلنڈر بھی دیوار پر پھسلتا ہوا فرش پر گر گیا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح آگے بڑھا اور کیلنڈر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کی ڈوری ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں احمقوں کی طرح منہ پھاڑے اس ٹوٹی ہوئی ڈوری کو دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اتفاق سمجھوں یا اپنی خواہش کا کرشمہ؟

اچانک مجھے اپنی آنکھوں کا خیال آیا۔ اب تک کئی افراد کو یہ محسوس ہو چکا تھا کہ میری آنکھوں میں کوئی غیر معمولی بات ہے جس کی وجہ سے وہ مجھ سے نظریں ملا کر بات نہیں کر سکتے۔ تو کیا واقعی میری آنکھوں میں کوئی غیر معمولی قوت ہے؟..... کوئی ایسی قوت جو کیلنڈر کو دیوار سے گرا سکتی ہے!

میں ابھی اس نکتے پر زیادہ غور نہیں کر سکا تھا کہ ملازم کافی لے کر آ گیا۔ اس نے کیلنڈر میرے ہاتھوں میں دیکھ کر کہا۔

”کیا اس کا فیتہ ٹوٹ گیا جناب!“

”آں..... ہاں۔“ میں نے چونک کر کہا۔

ملازم نے کافی کی ٹرے تپائی پر رکھ دی اور پھر میری طرف بڑھتا ہوا بولا: ”لایئے مجھے دیجیے! میں فیتے میں گرہ لگا کر.....“

”نہیں اب اسے یہاں مت لٹکانا۔“ میں نے کیلنڈر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ یہاں ہوا سے پھڑپھڑاتا ہے تو مجھے اس کی آواز بری معلوم ہوتی ہے۔“

”بہتر۔“

میں تپائی کے قریب کرسی پر جا بیٹھا۔ میرا ذہن بدستور اسی معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے کافی پیتے ہوئے سوچا کہ اگر میری آنکھوں میں واقعی کوئی غیر معمولی قوت ہے تو میں ان سے کچھ اور کام بھی یقیناً لے سکتا ہوں۔ مجھے اس کا تجربہ کر کے دیکھنا چاہیے۔

”آپ کھانا کس وقت کھائیں گے جناب!“ ملازم نے پوچھا۔

”ایک گھنٹے بعد۔“ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

ملازم چلا گیا تو میں نے ایک سگریٹ جلائی اور سیٹنگ روم سے اٹھ کر خواب گاہ میں چلا آیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اپنی آنکھوں کی قوت کے بارے میں کیا تجربہ کروں اور کیسے کروں؟ میری نظریں دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر کی طرف گئیں تو میں نے فیصلہ کیا کہ اگر پہلا کیلنڈر ایک اتفاق کے تحت گرا تھا تو اس کی تصدیق یا تردید کے لیے بھی کیلنڈر ہی کو آزمایا جائے۔ میں نے اس پر نظریں جمادی اور پوری شدت سے یہ خواہش کی کہ وہ ٹوٹ کر فرش پر گر پڑے میری نظریں کیلنڈر پر جمی ہوئی تھیں اور میرا ذہن جیسے چیخ چیخ کر اسے حکم دے رہا تھا۔

”ٹوٹ جاؤ..... گر جاؤ..... ٹوٹ جاؤ..... گر جاؤ!“

لیکھت کیلنڈر کا فیتہ ٹوٹنے کی آواز ہوئی اور وہ دیوار پر پھسلتا ہوا فرش پر گر گیا۔ یہ دیکھتے ہی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میں اچانک اپنے آپ کو بے حد تھکا ہوا محسوس کرنے لگا میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ اس تجربے کی کامیابی نے میرے سارے جسم میں سنسنی سی پھیلا دی تھی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس تجربے نے مجھے پر تھکن کیوں طاری کر دی تھی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اتنی جلدی جلدی اپنی آنکھوں کی اس قوت کو استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا؟..... میں اس سلسلے میں کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا لیکن بہر حال یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ میں ایک غیر معمولی قوت کا مالک ہوں۔

میں بہت دیر تک خیالات سے الجھا رہا اور پھر اس وقت چونکا جب ملازم میرے لیے کھانا لے کر آیا۔ میں خاصی بھوک محسوس کر رہا تھا اس لیے کھانے سے بڑی معقول حد تک انصاف کر سکا۔ کھانے کے بعد میں نے چائے بھی پی اور سگریٹ سلا کر کمرے سے نکل آیا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک میں راج محل کے وسیع و عریض دالانوں میں گھومتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ آخر میں اس



فیصلے پر پہنچا کہ صبح کا انتظار کر لیا جائے۔ راجہ شمشیر سنگھ سے دوسری ملاقات کے بعد ہی مجھے کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ ملازم وہاں موجود تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اب وہ جا کر آرام کرے۔ اسے رخصت کرنے کے بعد میں نے سنگ روم کا دروازہ بند کیا اور خوابگاہ کی طرف بڑھا۔ خوابگاہ میں داخل ہو کر میں اس کا دروازہ بند کرنے والا تھا کہ سنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی میں نے بے اختیار ایک طویل سانس لی اور اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ملازم مجھ سے کچھ کہنا بھول گیا ہوگا اس لیے واپس لوٹا ہے۔

لیکن دروازہ کھولتے ہی مجھے غیر متوقع طور پر سوشیلا نظر آئی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟ تم اس وقت؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

سوشیلا نے کوئی جواب دینے کی بجائے مڑ کر ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اسے دیکھ نہ لیا جائے۔ میں نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑا اسے اندر گھسیٹ لیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا جسم اس کے جسم سے ٹکرا گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری رگ رگ میں بجلی دوڑ گئی ہو۔ میں دروازہ بند کر کے پلٹا تو سوشیلا نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کنور! آپ خطرے میں ہیں۔ فوراً راج محل سے چلے جائے کسی طرح بھی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کیجیے!“

”خطرے کی نوعیت کیا ہے؟“ میں نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

”آپ نے بلونت کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ میں راج محل میں کچھ دیر رکنے کے بعد جب گھر جانے کے ارادے سے باہر نکلی تھی تو راستے میں ایک جھاڑی کے پیچھے سے مجھے کھسر پھسری کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ آپ کا نام بھی میرے کانوں میں پڑا تھا اس لیے میں ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔ وہ لوگ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے لیکن جب میں نے دھیان دے کر سننے کی کوشش کی تو میری سمجھ میں اتنا ضرور آ گیا کہ آج رات آپ کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“

”کس طرح؟“

”یہ میں نہیں سن سکی۔“

## جزیرے پر دھماکہ

ابن صفی کے دوست اور شاگرد ایچ اقبال کے تخلیق کردہ کردار میجر پرمود کا جاسوسی کارنامہ۔ ایک سنسان جزیرے پر ملک دشمن

عناصر کی قائم کردہ، اسلحہ فیکٹری کو تباہ کرنے کا مشن۔ یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

”وہ لوگ کون تھے؟“

”میں نے انہیں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور دیکھ بھی لیا تھا لیکن میں انہیں پہچان نہیں سکی۔ ویسے ان کا تعلق راج محل کی پولیس ہی سے ہے کیونکہ میں نے ان کی وردیاں پہچان لی تھیں۔“

”اسی لیے تمہارا خیال ہے کہ وہ بلونت کے آدمی تھے۔!“

”اور کیا سمجھا جاسکتا ہے!“ اس نے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

وہ شب خوابی کے لباس پر گون پہنے ہوئے تھی اور میرے اتنے قریب کھڑی ہوئی تھی کہ میں اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی مہکار سے مدہوش سا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے ساتھ لیجا کر بستر پر بٹھا دیا۔

”خطرے کی اس اطلاع کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں سوھیلا!“ میں نے اس کا ہاتھ اپنی گود میں رکھ کر ہولے ہولے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر کچھ چوری ہو کر کھڑی ہونے لگی۔ ”میں اب چلتی ہوں۔ میرا یہاں رکنا مناسب نہیں۔ آپ بھی جلد از جلد راج محل چھوڑنے کی کوشش کیجیے!“

”سنو تو! ابھی تم نے پوری بات کہاں بتائی ہے!“ میں نے اسے پھر بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم ان لوگوں کو پہچان لوگی اگر دوبارہ دیکھو؟“

”یقیناً پہچان لوں گی۔ ان میں سے ایک نے سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس جلائی تھی تو مجھے اس کا چہرہ دکھائی دے گیا تھا۔ سیاہ رنگ کے اس بد شکل آدمی کا ایک کان بھی کٹا ہوا تھا۔“

”اگر اس کا تعلق ریاست کی پولیس سے ہے تو اسے بہ آسانی پکڑا جاسکے گا۔ تم اس سلسلے میں زیادہ فکر مند نہ ہو۔ یہاں اس کمرے میں مجھ پر حملہ کرنا آسان نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم یہاں شب خوابی کے لباس میں ہو۔“

”آپ کو خطرے سے آگاہ کرنا ضروری تھا اس لیے میں اپنے گھر نہیں گئی تھی۔ میں اکثر راتوں کو راج محل میں رک جاتی ہوں۔ کلدیب ہی مجھے روک لیا کرتی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنے کچھ کپڑے لا کر کلدیب کے کمرے میں رکھ دیے ہیں۔ آج بھی میں اس کے کمرے میں ہوں۔“

”گھر والوں کو تمہاری فکر نہیں ہوتی!“

”میں انہیں فون کر دیتی ہوں۔“ سوھیلا نے کہا اور ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔ ”اب مجھے اجازت دیجیے

اور.....“

”ٹھیک ہے تم جاؤ!“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”تنہائی ہوگی تو میں میں نیند کے دباؤ سے سو جاؤں گا اور میرے دشمن اپنا



کام کر جائیں گے۔“

میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت سوشیلا میرے پاس سے جائے۔ وہی خوابناک سانسوانی چہرہ بار بار میرے تصور میں ابھر کر میرے جذبات کو برا بھانتہ کر رہا تھا۔ گزرے ہوئے لمحوں کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ذہن سارے خطروں کو نظر انداز کر کے خواہشات کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ سوشیلا کے مہکتے ہوئے گداز بدن کی قربت، وسیع خوابگاہ میں پھیلی ہوئی مدہم مدہم سی نیلی روشنی اور تنہائی میرے جسم میں آگ لگائے دے رہی تھی۔ میں مجسم آگ بنتا جا رہا تھا۔

”لیکن کنور! میں یہاں نہیں رک سکتی۔“ سوشیلا کے لہجے میں بڑی بے بسی تھی۔

میں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور اس کی مخمور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہیں رک سکتیں؟ مجھ سے ڈر لگتا ہے یا تم اپنے پتاجی کی طرح فری تھنکر نہیں ہو!“

سوشیلا نے اپنے شانے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی تھی اور آنکھوں میں تیرتے ہوئے گلابی ذوروں کا رنگ کچھ اور تیز ہو گیا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی: ”وہ تو سب کچھ..... ٹھیک ہے..... لیکن..... کنور!..... آپ کل دیب کو رکھنا چاہتے ہیں..... اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔“

”یہ سب ماضی کی باتیں ہیں سوشیلا!“ میں نے اس کے ہونٹوں پر جھکتے ہوئے سرگوشی کی: ”اور تم جانتی ہو کہ میرا ماضی مجھ سے کٹ چکا ہے۔ مجھے تو کل دیب کی شکل تک یاد نہیں۔“

پھر اس سے پہلے کہ سوشیلا کچھ کہتی میرے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے سرد ہونٹوں سے پوسٹ ہو گئے۔ سوشیلا کے دونوں ہاتھ میری پشت پر آہستہ آہستہ پھلنے لگے۔ میری طرح اسے بھی جذبات نے مغلوب کر لیا تھا۔ بدن کے تقاضوں پر بند نہیں باندھا جاسکتا۔ اور جب تقاضے پورے ہو گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں کوئی پہلا مرد نہیں تھا جو سوشیلا کی شبانہ زندگی میں داخل ہوا۔ اس کی رعنائیاں اچھوتی نہیں تھیں تاہم میں اپنی زندگی کی اس رات سے پوری طرح مطمئن تھا۔

سوشیلا نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور پھر اس پر نیند نے غلبہ پالیا۔ میں بدستور جاگتا رہا۔ جذبات کا ابال ختم ہونے کے بعد اب مجھے ان خطرات کا خیال آ رہا تھا جن کی نشاندہی سوشیلا نے کی تھی۔ میں سگریٹ سلگائے ہلکے ہلکے کش لیتا ہوا سوچ کے تانے بانے سے الجھ رہا تھا کہ سینک روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ فوراً ہی دستک پھر ہوئی اور میں بستر سے اتر آیا۔ سوشیلا بدستور بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے لب اس طرح نیم واتھے جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔ میں نے اسے چادر اڑھادی اور پھر دروازے کی طرف پلٹا۔

سینک روم کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں..... بلونت“ غراتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

کیا یہ براہ راست حملے کے موڈ میں ہے؟ میں نے سوچا۔

”دروازہ کھولو!“ بلونت کی غراہٹ پھر سنائی دی۔ میں نے چٹنی کھولی اور دروازہ کھولتا ہوا بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں ہر قسم کے حملے کے لیے تیار رہنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے بلونت کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہیں دکھائی دیا۔

”مہاراج نے تمہیں یاد کیا ہے۔“ وہ مجھے گھورتا ہوا بولا۔

”اس وقت؟..... خیر تو ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”یہ مہاراج ہی بتا سکیں گے۔“ بلونت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”جلدی کرو۔ مہاراج کا حکم تھا کہ میں تمہیں فوراً لے کر

پہنچوں۔“

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ اندرونی کمرے میں سوشیلا سو رہی تھی۔ میری عدم موجودگی میں کوئی یہاں آ کر اسے دیکھ لیتا تو یہ بہت بری بات ہوتی۔ بلونت کے سامنے میں سوشیلا کو اٹھا کر رخصت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”کیا تمہیں مہاراج کے حکم کی کوئی پروا نہیں ہے پر تاب سنگھ!“ بلونت تیز لہجے میں بولا۔ ”وہ فوراً تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”اچھا..... چلو!“ میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا اور باہر نکل آیا لیکن میں بلونت کی طرف سے پوری طرح چوکنار ہا تھا۔

بلونت ایک طرف مڑ گیا تو میں دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے ہولیا۔

راجہ شمشیر سنگھ واقعی بڑی بیتابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا بلا ہو!“

”جی!“ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے خود ہی ہسپتال دوڑا چلا گیا تھا۔ میرا ذاتی ہوائی جہاز ہے اس لیے مجھے کوئی دشواری نہیں

ہوئی تھی لیکن وہاں جا کر میں مصیبت میں پھنس گیا جیسے ہی میں نے تمہارے بارے میں پوچھ گچھ شروع کی وہاں کھلبلی مچ گئی۔ مجھے چوروں

کی طرح پکڑ لیا گیا اور کوئی نصف درجن شخصیتوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ سب تمہارے بارے میں کچھ جان لینے کے لیے

بے چین تھے۔! ان میں پولیس انسپکٹر جوگیندر سے لے کر برطانوی سفیر تک موجود تھے۔“

”برطانوی سفیر۔“ میں زیر لب بڑبڑایا۔

”ہاں..... اور وہ سب مجھ سے ایک ہی سوال کر رہے تھے کہ میں تمہیں کیسے جانتا ہوں اور اب تم کہاں ہو!“

”پھر آپ نے انہیں کیا جواب دیا؟“ میں نے بے مبری سے پوچھا۔

”میں نے بات بنادی تھی میں نے کہا تھا کہ تصویر والے آدمی کی شکل میرے ایک عزیز سے ملتی جلتی ہے اور وہ بہت عرصے سے

مجھ سے نہیں ملے۔“ ”راجہ شمشیر سنگھ نے کہا“ پھر بولا۔ ”لیکن مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔ اگر میں کوئی عام

آدمی ہوتا تو شاید پولیس مجھے حراست میں ہی لے لیتی لیکن اب بھی مجھے خدشہ ہے کہ شاید مرکزی جاسوس راج محل کے گرد منڈلانا شروع



کر دیں گے۔ اب اگر تمہیں یہاں سے پکڑا گیا تو اخبارات اسی خبر کو لے اڑیں گے اور عین ممکن ہے کہ میری بیٹی کا معاملہ بھی طشت از بام ہو جائے اگر ایسا ہوا تو.....“

شمشیر سنگھ نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ مجھے اس کی پریشانی اور الجھن کا خوب اندازہ تھا لیکن میری اپنی الجھن بھی کم نہیں تھی۔ یہ بہت حیرت انگیز تھا کہ برطانوی سفیر جیسی شخصیتیں میری ذات میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ آخر میں کون تھا؟ میری کیا اہمیت تھی؟

”بلونت!“ راجہ شمشیر سنگھ بے بسی سے بولا: ”اب تم ہی کوئی مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”اگر راجہ جگماری دستیاب ہو چکی ہو تو میں بڑی آسانی سے آپ کو یہ مشورہ دے دیتا کہ ان حضرات کا گلا گھونٹ دیا جائے اور ان کی لاش آپ ان لوگوں کے حوالے کر دیں جو ان میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“ بلونت نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میں راجہ شمشیر سنگھ سے بولا۔ ”کیوں نہ آپ راجہ جگماری کی تلاش میں مجھ سے تعاون کریں۔“

”تم اسے کیوں ڈھونڈنا چاہو گے۔؟“

”میں ان سے بہت قریب ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا اور پھر شمشیر سنگھ کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر جلدی سے بات آگے بڑھا دی۔ ”ممکن ہے میں نے انہیں کچھ ایسی باتیں بتائی ہوں جن کے سامنے آنے سے میری یادداشت لوٹ آئے۔ اس کے علاوہ راجہ جگماری کو تلاش کرنا میرے لیے یوں بھی ضروری ہے کہ وہ..... وہ..... میرے.....“ میں نے ہچکچا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

راجہ شمشیر سنگھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بلونت کی آنکھوں سے ایک بار پھر کینہ توڑی جھلکنے لگی۔ اگر اس کا بس چلتا وہ مجھے کچا چبا جاتا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے ہی وہ سکوت توڑا۔ ”مہاراج! جو ہوا سو ہوا“ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے تعاون کریں یا نہ کریں لیکن میں آپ کی بیٹی کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا اور باقی ماندہ مسئلے کا حل وہی ہوگا جو آپ چاہتے تھے جو میں بھی چاہتا تھا مگر جو میرے نامعلوم دشمنوں کو کسی وجہ سے پسند نہیں تھا۔“

## عشق کا عین

عشق کا عین..... علیم الحق حق کے حساس قلم سے، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی داستان، ع..... ش..... ق کے حروف کی آگاہی کا درجہ بہ درجہ احوال۔ دورِ حاضر کا مقبول ترین ناول..... ایک ایسا ناول جو آپ کے سوچنے کا انداز بدل کر آپ کی زندگی میں مثبت تبدیلی لے آئے گا۔ **کتاب گھر کے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔**

”کون ساحل؟“ راجہ شمشیر سنگھ جیسے بے خیالی کے عالم میں پوچھ بیٹھا۔

میں نے جواب دیا۔ ”آپ نہیں چاہتے تھے کہ کلدیب کور میری نشانی کو اپنے گلے سے لگائے رہے اور میں بھی یہی چاہتا تھا چنانچہ کلدیب کور کی بازیابی پر پہلا کام یہی کیا جائے گا اور پھر میں کلدیب کور کی زندگی سے یوں نکل جاؤں گا جیسے کبھی اس سے ملا ہی نہیں تھا۔

”لیکن کیا راجکاری اس پر آمادہ.....“

بلونت کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ایک خوفناک دھماکے سے راج محل کی مضبوط عمارت لرز اٹھی۔

”یہ کیا!“ بلونت اچھل پڑا۔

”یہ کیسا دھماکہ تھا!“ راجہ شمشیر سنگھ متوحش انداز میں بولا۔ میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال چمکا۔

”سوشیلا!“ میں نے غیر ارادی طور پر سرگوشی سی کی اور پھر ایک دم وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میرا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔

راجہ شمشیر سنگھ اور بلونت میرے پیچھے پیچھے تھے۔

میرا خیال غلط نہیں نکلا۔ راج محل کا وہ حصہ جو میری رہائش کے لیے مخصوص تھا، لمبے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ آہ!..... میں اپنی اس وقت کی کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ میں ایک انسان ہوں اور سوشیلا نے مجھے متاثر بھی کیا تھا۔ اسے میری زندگی کی فکر لاحق تھی اور اس چکر میں پڑ کر وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس کا کندن ایسا جسم منوں مٹی کے نیچے دب چکا تھا۔ ایک خوبصورت اور بھرپور جوانی محض میری وجہ سے خاک کا ڈھیر بن چکی تھی۔ اب اگر میں جذبات سے مغلوب نہ ہو جاتا تو اور کیا ہوتا۔ میری پلکیں نمناک ہو گئی تھیں اور دل کی گہرائیوں سے لاوا ابل رہا تھا۔ اس وقت مجھے ہسپتال کی نرس آسیہ یاد آئی جس نے مجھے اپا لو کا نام دیا تھا۔

میں واقعی اپا لو تھا۔

یونانی دیوتا اپا لو!

جو حسن میں یکتا تھا!

جو جسم قہر تھا!

اور تباہی و بربادی جس کے جلو میں چلتی تھی۔!

”سوشیلا! میں اپنے دشمنوں سے تیری موت کا انتقام لوں گا۔“ میں دانت کچکچا کر بڑبڑایا۔

اسی وقت کسی نے پشت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بلونت کی شکل نظر آئی۔

”کیا تمہارے کمرے میں سوشیلا تھی۔؟“ بلونت نے دبی آواز سے پوچھا۔

اس لمحے اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ سوشیلا کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں اور



ان باتوں کی روشنی میں بلونت ہی سوشیلا کا قاتل نظر آ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں نے برقی سرعت کے ساتھ اس کا گلا دبوج لیا۔ مجھے پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور میرے حملے میں ایسی مجنونانہ شدت تھی کہ بلونت کوشش کے باوجود اپنی گردن نہ چھڑا سکا۔

میں شاید اسے ختم ہی کر دیتا لیکن راجہ شمشیر سنگھ آڑے آیا۔ دھماکے کی آواز سن کر محل کی سپاہ اور دوسرے بہت سے افراد وہاں پہنچ چکے تھے۔ راجہ شمشیر سنگھ کا اشارہ ملتے ہی ان میں سے کئی سپاہی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اب مجھے مدافعت بھی کرنا پڑی تو بلونت کی گردن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ مری ہوئی چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر گرا۔

میں اس وقت بڑے وحشیانہ انداز میں لڑ رہا تھا۔ نصف درجن سپاہی مجھ پر پلے پڑ رہے تھے لیکن میں ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ البتہ انہی میں سے دو ایک زمیں بوس ہو چکے تھے۔ شاید میں ایک ایک کر کے ان سبھی کو ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ کر دیتا لیکن اسی وقت راجہ شمشیر سنگھ چلا یا۔

”کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے پر تاب سنگھ؟..... اپنے ہاتھ روکو ورنہ میں ان سپاہیوں کو حکم دوں گا کہ یہ تمہیں گولی سے اڑا دیں۔“

میں یلکھت راجہ شمشیر سنگھ کی طرف گھوم گیا اور اسے گھورتا ہوا بولا۔ ”میں بلونت کی زندگی مٹا دینا چاہتا ہوں۔ اس نے ایک بے گناہ لڑکی کی جان لی ہے۔ میں اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔“

”نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو! بلونت کسی بیگناہ کی جان کیوں لینے لگا۔“

”وہ مجھ سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ آج شام اس نے مجھ سے بدتمیزی کی تھی تو میں نے اسے ایک گھونہ مار دیا تھا۔ اسی بناء پر یہ ذلیل شخص میری جان کا دشمن ہو گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے ختم کر دیں اور وہ بد بخت میرے بستر پر سوتی ہوئی سوشیلا کو میرے دھوکے میں بم سے اڑا بیٹھے۔“

”سوشیلا؟“ راجہ شمشیر سنگھ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”وہ تمہارے کمرے میں کیسے پہنچ گئی۔“

”آج شام کو میں اس کے ساتھ ٹینس کھیلا تھا۔ بلونت سے میری لڑائی اس کے سامنے ہوئی تھی۔ بعد میں کسی طرح اسے پتا چلا تھا کہ بلونت مجھے ہلاک کروانے کی فکر میں ہے چنانچہ وہ مجھے خبردار کرنے آئی تھی۔ مجھے خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد وہ کمرے سے چلی جاتی لیکن اسی وقت بلونت آپ کا پیغام لے کر آ گیا۔ وہ بلونت سے خائف رہتی تھی اسی لیے کمرے میں دبک گئی۔ میں واپس جا کر اسے اپنے کمرے سے روانہ کر دیتا لیکن اس سے پہلے ہی یہ حادثہ ہو گیا۔“

”اور تم سمجھتے ہو کہ ایسا کرنیوالے بلونت کے آدمی تھے۔؟“

”ظاہر ہے۔“

”گویا بلونت کو معلوم ہوگا کہ اس وقت اس کے آدمی کمرے میں بم پھینکیں گے؟“

”ہاں۔“

”تو پھر بلونت احمق تھا جو تمہیں تمہارے کمرے سے نکال لایا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مجھے کسی بہانے سے اس ملاقات سے باز

رکھتا۔“

میں نے غور کیا تو مجھے راجہ شمشیر سنگھ کی دلیل کافی وزنی معلوم ہوئی۔ مجھے ہلاک کرنے کی یہ سازش بلونت کی نہیں ہو سکتی تھی۔ تو پھر؟ کیا یہ حملہ بھی میرے نامعلوم اور پراسرار دشمنوں ہی نے کرایا تھا۔؟

راجہ شمشیر سنگھ نے اپنے آدمیوں کو بلے کے بارے میں کچھ ہدایت دیں اور پھر مجھ سے بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ!“

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ مجھے اب یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے حالات کے تند و تیز دھارے پر میرا وجود کسی حقیر تنکے کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے۔ میرے دشمن جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ وہ تو میری قسمت ہی یاوری کر رہی تھی ورنہ میں کبھی کا ہلاک ہو گیا ہوتا۔

راجہ شمشیر سنگھ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور گھورتا ہوا بولا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں بلاتا خیر راج محل چھوڑ دینا چاہیے۔ کلدیب کور ملے یا نہ ملے، میں تمہارے منحوس وجود سے نجات حاصل کر لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم یہاں رہے تو مجھے ڈر ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا یا راج محل کی اینٹ سے اینٹ بج جائیگی۔ میں حیران ہوں کہ سوشیلا کے باپ کو کیا جواب دوں گا۔ وہ بہت پیاری بچی تھی۔ اس کی موت کا اعلان ہوتے ہی کہرام مچ جائیگا۔ اگر تم یہاں رُکے تو شاید بدنامی بھی اس بد نصیب خاندان کا مقدر بن جائے گی۔“

”بہتر ہے..... میں چلا جاؤں گا۔“ میں ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”لیکن کیا آپ اس معاملے کی تفتیش نہیں کریں گے؟ آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ محل ہی کے آدمی میرے دشمنوں کا آلہ کار بن گئے۔“

”محل کے آدمی؟“

”جی ہاں، سوشیلا نے بتایا تھا کہ مجھے ہلاک کرنے کا پروگرام بنانے والے محل کے سپاہیوں کے وردی میں تھے اور ان میں سے ایک شخص کا کان کٹا ہوا تھا۔

راجہ شمشیر سنگھ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنی سپاہ کے کسی کن کٹے شخص سے واقف رہا ہو۔

”میں آپ سے ایک درخواست اور کرنا چاہتا ہوں۔“ میری آواز سن کر راجہ شمشیر چونک پڑا۔

”کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کلدیب کور کے کاغذات کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس کی ڈائری سے مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔“

راجہ شمشیر سنگھ نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر اس سلسلے میں مجھ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ خود ہی مجھے لے کر کلدیب کور کے کمرے میں پہنچا اور پھر مجھے وہاں تنہا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ میں نے جلدی جلدی کمرے کی تلاشی لینا شروع کی مجھے ایک چھوٹی سی ڈائری مل گئی جس میں کلدیب کور، یادداشتیں، تقریبات کی تاریخیں اور ضروری پتے نوٹ کرتی تھی۔ اس میں مجھے ”کنور پرتاب سنگھ“ کا پتہ مل



گیا۔ وہ دارالحکومت کے ایک فرسٹ کلاس ہوٹل کا پتا تھا۔ میں نے وہ ڈائری اپنی جیب میں ڈال اور کلدیب کور کے کمرے سے نکل آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس ہوٹل میں پہنچ کر اپنے بارے میں چھان بین کرنا ہوگی۔

میں جیسے ہی کلدیب کور کے کمرے سے نکلا ایک ملازم نے میرے قریب آ کر کہا۔ ”مہاراج دیوان خانے میں آپ کے منتظر ہیں۔“

”وہاں تک میری رہنمائی کرو۔!“ میں نے ملازم سے کہا۔

ملازم نے مجھے دیوان خانے تک پہنچایا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے قدم ٹھٹھک کر رک گئے۔ مہاراج کے ساتھ وہاں ایک کن کٹا شخص بھی موجود تھا اور اس کے جسم پر نظر آنے والی وردی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ محل کے سپاہ میں کوئی عہدیدار ہے۔

”یہ بے قصور معلوم ہوتا ہے۔“ راجہ شمشیر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”اے اس کے کوارٹر سے یہاں لایا گیا ہے۔ یہ وہاں بے خبر سو رہا تھا۔ یہ اس بات سے لاعلم ہے کہ دھماکہ کیا ہوا تھا۔“

”بہت خوب!“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر یہ شخص بہرہ ہے تو یقیناً بے گناہ ہوگا ورنہ اس وقت راج محل میں کون ہے جو بے خبر سو رہا ہو یا جسے یہ علم نہ ہو کہ دھماکہ راج محل کے کس حصے میں ہوا ہے۔“

راجہ شمشیر کے جواب دینے سے پہلے ہی کن کٹا بول اٹھا۔

”میں بے شک بے خبر سو رہا تھا لیکن میں نے یہ کب کہا کہ دھماکہ سے لاعلم ہوں۔ اس وقت میری آنکھ کھل گئی تھی لیکن میں دھماکے کی نوعیت کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ مجھ پر اتنی تھکن طاری تھی کہ میں دوبارہ سو گیا تھا۔“

میں اسے گھورتا رہا۔ وہ بڑی معصوم صورت بنائے بیٹھا ہوا تھا مجھے حیرت تو اس بات پر تھی کہ راجہ شمشیر سنگھ نے اس کی الٹی سیدھی تاویلات پر بڑی آسانی سے یقین کر لیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ شمشیر سنگھ کو سوشل کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

”میں اس شخص کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

راجہ شمشیر سنگھ نے کسی تذبذب کے بغیر میری بات مان لی۔ اس نے اپنے چند آدمی میرے ساتھ کر دیے اور میں ان کی معیت میں کن کٹے کے کوارٹر تک پہنچا۔

تلاشی میں مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی سکی جو مشتبہ ہو اور کسی طرح کن کٹے کے جرم کی طرف اشارہ کر سکے۔ تلاشی کے دوران میں کن کٹا مجھے نفرت انگیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر فکر و ترد کے آثار بالکل نہیں تھے اور وہ بالکل مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی خفیف سی مسکراہٹ تو مجھے ذہری لگ رہی تھی۔

راجہ شمشیر سنگھ نے جن آدمیوں کو میرے ساتھ بھیجا تھا وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ میں ان کو نظر انداز کر کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کن کٹے کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں رگ گیا۔ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا اور پھر دھیمی

آواز میں بولا۔

”اگر تم ان لوگوں کی طرف صرف اشارہ ہی کر دو جنہوں نے تم کو مجھے ختم کرنے پر مامور کیا تھا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں مہاراج سے معافی دلا دوں گا۔“

”پتا نہیں آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔“ کن کٹا بڑے اطمینان سے بولا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

میں ہونٹ بھیجنے کی طرف سے مڑ گیا۔ اب میں طائرانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک میری نظریں ایک چیز پر ٹھٹھک گئیں۔ وہ ردی کی ٹوکری تھی۔ میں نے ابھی تک اس کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ ٹوکری کے قریب ہی گتے کا ایک ڈبہ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے وہ ڈبہ اٹھایا اور غور سے کن کٹے کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرائے کسی اور سمت میں دیکھ رہا تھا۔

”اس ڈبے میں تم کیا لائے تھے؟ میں نے اچانک تیز آواز میں پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے کن کٹے کے چہرے کی رنگت بدل گئی لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور مسکراتا ہو بولا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟..... کیا اس ڈبے میں بم چھپا کر لایا جاسکتا ہے؟“

مجھے یقین ہے کہ اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے یہ جملہ محض اس لیے کہا تھا کہ اسے معقول جواب سوچنے کے لیے کچھ مہلت مل جائے۔

”سیدھے سادے انداز میں جواب دو!“ میں نے غرا کر کہا۔

اتنی دیر میں شاید کن کٹے نے کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ فوراً ایک گوشے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہاں رکھی ہوئی شیلیف میں سے اس نے

چند کتابیں نکالیں اور پھر میرے قریب آیا۔

”یہ لایا تھا میں اس ڈبے میں۔“ اس نے کتابیں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ڈبے میں کتابیں!“ میں چیختے ہوئے لہجے میں بولا۔

”باندھنے کے لیے تسلی نہیں ملی تھی اس لیے دوست نے ڈبے میں رکھ کر دے دیں۔ آپ کو اعتراض ہے کوئی؟“

”گویا تحفہ ملا تھا تمہیں؟“

”نہیں میں نے عاریتاً لی تھیں۔“

”دوست کا نام اور پتا بتاؤ!“

کن کٹے نے کسی جھجک کے بغیر اپنے دوست کا نام اور پتا بتا دیا جسے میں نے اپنے پاس نوٹ کر لیا۔

اب میں ردی کی ٹوکری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس میں سے کچھ ردی کاغذ ہاتھ لگے۔ ان کی شکلیں اس قسم کی تھیں جن سے اندازہ



ہوتا تھا کہ وہ گتے کے ڈبے پر لپٹے ہوئے ہوں گے۔ ان پر اسکاچ ٹیپ کے چند ٹکڑے بھی لگے ہوئے تھے۔

”باقاعدہ پیک کر کے کتابیں لائے تھے؟“ میں نے کن کن کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”آپکو اعتراض ہے کیا؟“ وہ شاید مجھے چڑانے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

میرادل چاہا کہ اس کے ایک ہاتھ رسید کر دوں۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے میں اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ردی کا غذا بھی تک میرے ہاتھ میں تھے۔ الٹ پلٹ کر ان کا جائزہ لینے لگا اور دفعتاً ایک ایسی چیز میری نظروں میں آئی کہ میں چونک پڑا۔

کاغذ پر کسی فرم کا نام اور پتا چھپا ہوا تھا اور ہاتھ کی کوئی تحریر بھی تھی جسے کاٹ دیا گیا تھا۔ میں نے فوراً وہ کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور دروازے کی طرف مڑا۔

رہبہ شمیر سنگھ کے آدمی کن کنے کو اپنے ساتھ لیے ہوئے میرے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلے اور مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کن کننا حراست میں ہو۔ ظاہر ہے کہ رہبہ شمیر سنگھ ہی کی ہدایت پر ایسا ہوا ہوگا۔

جب میں رہبہ شمیر سنگھ کے پاس پہنچا تو وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

”تم نے اپنا اطمینان کر لیا؟“ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

”نہیں میں مطمئن نہیں ہو سکا ہوں۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

”پھر اب تم کیا چاہتے ہو؟“

”آپ کی خواہش کے مطابق میں اسی وقت راج محل سے رخصت ہو جاؤں گا لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ آپکو جلد یا بدیر آپکی بیٹی سے ملوا دوں گا۔ جب تک میں کلدیب کور کو تلاش نہ کر لوں مجھے چین نہیں آ سکتا۔“

رہبہ شمیر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ”تم اس کی ضرورت یقیناً محسوس کر رہے ہو گے۔“

اس موقع پر میرا جذباتی فیصلہ تو یہ ہوتا کہ روپے لینے سے انکار کر دوں لیکن میں نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔ نوٹوں کی گڈی لیتے ہوئے کہا۔

”میں اس عنایت کے لیے آپکا شکر گزار ہوں لیکن یہ روپے مجھ پر قرض رہے۔ ایک نہ ایک روز میں یہ آپ کو واپس لوٹا دوں گا۔“

”اب تم جاسکتے ہو۔“

”بلونت.....“

”اسے ہوش آچکا ہے۔“

”میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں جوش کی حالت میں وہ سب کچھ کر گزرا۔“

”میں تمہارا اظہارِ افسوس بلونت تک پہنچا دوں گا۔“

”مجھے پھانک پر باہر نکلنے سے روکا تو نہیں جائے گا؟“

”نہیں میں ہدایت دے چکا ہوں کہ تمہیں جانے دیا جائے۔“

”بہتر ہے۔ شکریہ!“

صبح طلوع آفتاب سے پہلے میں راج محل سے نکل آیا۔ مجھے زنجن پور کے بازاروں میں اس فرم کا دفتر تلاش کرنا تھا جس کا لیٹر ہیڈ مجھے کن کٹے کے کمرے میں ردی کی ٹوکری سے ملا تھا۔ اس کی تلاش میرے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں بنی۔ سورج کی ابتدائی کرنیں آسمان کو منور کر رہی تھیں جب میں مطلوبہ دفتر کے سامنے پہنچا تو دفتر کھلنے میں ابھی دیر تھی لیکن دو بھنگی وہاں کی صفائی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان کو باتوں میں الجھا کر اور کچھ روپے انعام میں دے کر میں ان سے اس فرم کے کرتا دھرتا کا پتا معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

فرم کے مالک کا نام پرکاش تھا اور اس کی رہائش دفتر سے قریب ہی تھی۔ وہ ایک تعیش پسند شخص تھا اور غالباً اسی لیے اپنے خاندان والوں سے الگ تھلگ ایک فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔ جب میں نے اس کے دروازے پر دستک دی تو وہ شاید محو خواب تھا کیونکہ اسے دروازے تک آنے میں کچھ دیر لگی تھی۔ دروازہ کھول کر جب اس نے ایک اجنبی کو سامنے پایا تو بڑے جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

”کیا ہے؟“

میں فوراً بھرائی ہوئی آواز میں گھبراہٹ کا عنصر شامل کرتے ہوئے کن کٹے کا نام لے کر کہا۔ ”مجھے دیو پرشاد نے بھیجا ہے۔ ہم نہیں پھٹ سکا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ پرکاش کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور پھر اس نے چونک کر مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”مگر..... تم کون ہو؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا!“

اب کسی قسم کی ہچکچاہٹ کام خراب کر دیتی اس لیے میں ایک دم اسے دھکیلتا ہوا اندر گھس گیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا بولا۔ ”میں وہ ہوں جس کو ختم کرنے کے لیے تم نے دیو پرشاد کو ہم سپلائی کیا تھا۔ وہ ہم پھٹ چکا ہے اور ایک بے گناہ کی زندگی اس کی نذر ہو چکی ہے۔ اب میں تم کو بھی موت کی آغوش میں پہنچا دینا چاہتا ہوں۔“

پرکاش کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میرے لہجے کی سفاکی محسوس کر کے وہ بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ یوں بھی وہ کچھ مضبوط اعصاب کا مالک نہیں معلوم ہوتا تھا اور اس کی جسمانی صحت بھی کسی کے لیے قابل رشک نہیں تھی۔ یکبارگی اس نے مڑ کر مجھ سے دور بھاگنا چاہا لیکن وہ مجھ سے زیادہ تیزی نہیں دکھاسکا۔ میں نے جست لگا کر اسے یوں دبوچ لیا جیسے بلی بھاگتے ہوئے چوہے کو پکڑتی ہے۔ وہ ذبح



ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخنے لگا لیکن مجھے اس پر بالکل ترس نہیں آیا۔ میں اسے اٹھا کر اندرونی کمرے میں لے گیا اور بستر پر پٹخ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس سے پوچھ کچھ شروع کرنے سے پہلے میں اس کی باقاعدہ مزاج پرسی کر لینا چاہتا تھا لیکن مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ احتیاط نہیں برت سکا۔ میرا ایک گھونسا اس کی کپٹی پر کچھ اس طرح لگا کہ اس کے ہوش و حواس زائل ہو گئے۔

”بس اب کھیل ختم ہو گیا۔ اسے چھوڑ کر الگ ہٹ جاؤ!“

میں چونک پڑا۔

خوابگاہ کے ایک دروازے سے تو میں داخل ہوا تھا لیکن وہاں صرف وہی ایک دروازہ نہیں تھا۔ دوسرے دروازے میں مجھے ایک بھاری بھر کم آدمی کھڑا نظر آیا جس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کا رخ میری طرف تھا۔ ریوالور کی نال پر سائیلنسر فٹ تھا۔

”تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ ریوالور خاموشی سے فائر کر سکتا ہے تمہاری موت پر بھیڑ نہیں لگ سکے گی اس لیے جو کچھ بھی کہوں، خاموشی سے کرتے چلے جاؤ!“ طویل القامت اجنبی نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا۔

مدھم روشنی میں اس کا چہرہ تو مجھے صاف طور پر دکھائی نہیں دے سکا لیکن اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ فطری طور پر سفاک اور بے رحم واقع ہوا ہے۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا: ”مجھے معلوم ہوا تھا کہ پرکاش یہاں اکیلا رہتا ہے!“

”تم نے ٹھیک ہی سنا تھا میں دیو پرشاد کی طرف سے تمہاری موت کی خبر سننے کے لیے رک گیا تھا لیکن تم بہت ہی سخت جان ہو۔ پانچواں حملہ بھی ناکام ہو گیا۔“

”پانچواں؟“ میں حیرت سے بولا۔

”ہاں..... پانچواں..... لیکن یہ چھٹا موقع رائیگاں نہیں جائیگا۔ میرے ریوالور کی گولی تمہارے سینے میں پیوست ہونے کے لیے بے چین ہے۔“

پھر ایسا معلوم ہوا تھا جیسے طویل القامت اجنبی کی انگلی ٹرائیگر دبانے ہی والی ہو۔ یلکھت میرے جسم کے تمام مساموں سے ٹھنڈا پسینہ بہہ نکلا۔ موت کو اتنا قریب دنیا کے بہت کم لوگ دیکھ سکے ہیں اور جنہوں نے دیکھا ہے ان کی حالت مجھ سے مختلف نہیں ہوئی ہوگی۔ میرے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی تھی اور میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس وقت موت کو جل دیکر نکل جانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اچانک مجھے اپنی آنکھوں کی غیر معمولی قوت کا خیال آیا اور میں نے خود سے سوال کیا کہ کیا میں اس موقع پر اس قوت کو استعمال کر سکتا ہوں؟

”سنو!“ اچانک میں ہاتھ اٹھا کر جلدی سے بولا: ”کیا تم واقعی مجھے ہلاک کر دینا چاہتے ہو؟“

”جب گولی تمہارے سینے کے پار ہو جائیگی تو تمہارا یہ شبہ خود بخود دور ہو جائے گا۔“ اجنبی نے تسخرانہ لہجے میں کہا۔

”لیکن یہ بات تم مجھ سے نظریں ملا کر نہیں کہہ رہے ہو۔“

”کیوں! میں ایسا کرنے سے کیوں کتراؤں گا۔“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر قدرے گھبراہٹ نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بہت جلد مجھ سے نظریں چرا لے گا۔

میں فوراً بولا۔

”خبردار تم مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ تم مجھے گولی بھی نہیں مارو گے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ہرگز نہیں کر سکتے۔“

ہرگز نہیں کر سکتے۔“

میں ایک جوا کھیل رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں جیت کس کی ہوگی نتائج سامنے آنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اجنبی کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی اور ریوالور والا ہاتھ کپکپانے لگا تھا۔ مجھے اپنی کامیابی کی امید نظر آئی تو میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔

”ٹرائیگر پر سے اپنی انگلی کا دباؤ ختم کر دو۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”مجھ سے نظریں ملائے ہوئے کھڑے

رہو۔ میں جو کچھ کہوں اس پر عمل کرتے چلے جاؤ۔ تم مجھ پر فائر نہیں کرو گے۔ بہتر یہ ہے کہ ریوالور پھینک دو۔“

اجنبی کے ریوالور والے ہاتھ کی کپکپاہٹ بڑھ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ریوالور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ انگلیاں

آہستہ آہستہ ریوالور کے دستے سے الگ ہو رہی تھیں۔ اجنبی کسی معمول کی طرح میری طرف دیکھے جا رہا تھا اور اس کے چہرے پر سفیدی

پھیل گئی تھی۔

کھٹ کی آواز کے ساتھ ریوالور فرش پر گرا اور میرے ہونٹوں پر ایسی فاتحانہ مسکراہٹ آگئی جیسے میں نے ہفت اقلیم کو زیر نگین کر لیا

ہو۔

طویل القامت اجنبی پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت کھڑا ہوا تھا۔

”سنو!“ میں نے تیز قسم کی سرگوشی کی۔ ”کیا تم میری آواز سن رہے ہو۔؟“

”اجنبی کے ہونٹ ہلے اور ایک مدہم سی آواز سنائی دی۔“ ”ہاں“

”اب تم میری ہر بات کا جواب دو گے..... سمجھے؟“

”ہاں۔“ ویسی ہی مدہم آواز!

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ قوی امید تھی کہ اس طویل القامت اجنبی سے مجھے بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔ شاید میری

تمام الجھنیں رفع ہو جائیں۔ میری کھوئی ہوئی شخصیت مجھے واپس مل جاتی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے اس پوچھا۔



”زردار بیگ۔“

”تم مجھے کیوں ختم کرنا چاہتے تھے؟“

”کیشپ نے مجھے اس کام کے لیے بڑی بھاری رقم دی تھی۔“

”کیشپ کون؟“

”بوڑھا کیشپ!..... وہ ایک پراسرار شخصیت ہے۔ اس کے خاص آدمی اسے مقدس کیشپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔“

یہ جواب سن کر میرے ذہن میں سرسراہٹ سی ہونے لگی اور میں نے کہا۔ ”اس بوڑھا کا حلیہ بتاؤ!“

زردار بیگ نے حلیہ بتایا اور میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ حلیہ اس چہرے پر منطبق ہوتا تھا جسے میں اپنے تصور میں

دیکھتا رہا تھا۔

”خیر۔“ میں نے کہا۔ ”زردار پہلے تم مجھے بتا چکے ہو کہ یہ مجھ پر پانچواں حملہ تھا جو نا کام ہو گیا۔ کیا پہلا حملہ بھی تم نے کیا تھا۔؟“

”کب؟ کیسے؟ مجھے ساری باتیں تفصیل سے بتاؤ!“

”دو دن قبل بوڑھے کیشپ نے مجھے تمہاری تصویر دی تھی اور تمہارے ہوٹل کا پتا بتایا تھا۔ مجھے اس سے ایک معقول رقم ملی تھی اس

لیے میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسی روز تمہیں ختم کروں گا۔ میں تمہارے ہوٹل پہنچا۔ اس وقت ایک ویٹر خالی برتنوں کے ڈرے

لیے ہوئے تمہارے کمرے سے نکل رہا تھا۔ میں لپک کر تمہارے کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ تم دروازہ اندر سے بند کر لو میں

اندر گھس جانا چاہتا تھا لیکن تمہیں دروازہ بند کرنی کی جلدی نہیں تھی۔ تم کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تمہارے ایک ہاتھ میں بریف

کیس اور دوسرے ہاتھ میں ایک ٹیلیگرام تھا جسے تم جیب میں رکھنے جا رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور ریوالور سے تم پر گولی چلا دی مگر تم

اپنی پھرتی کی وجہ سے بچ گئے۔ میری دوسری یا تیسری گولی ضرور نشانے پر بیٹھتی لیکن تمہاری قسمت اچھی تھی۔ برابر کے کمرے سے ایک

خاتون نے نکل کر شور مچا دیا۔ اب میں خطرے میں پڑ جاتا اس لیے میں اس کام کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر کے وہاں سے بھاگ نکلا۔

تم میرے پیچھے دوڑے اور چلی منزل کے کوریڈور میں تم نے مجھے آلیا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے بے خیالی میں اپنا ریوالور جیب

میں رکھ لیا تھا۔ مجبوراً مجھے تم سے بھڑ جانا پڑا۔ تم میری توقع سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے۔ بمشکل تمام مجھے بھاگ نکلنے کا موقع مل سکا۔ اس

دھماچو کڑی میں تمہارے ہاتھ میں دبا ہوا ٹیلیگرام پھٹ گیا تھا۔ دوسرا ٹکڑا میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ اسے میں نے یونہی اپنی جیب میں ڈال

لیا۔ بعد میں جب بوڑھے کیشپ کے سامنے اس کا ذکر آیا تو اس نے وہ ٹکڑا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اسے دیکھنے کے بعد اس نے اس کے

بارے میں چھان بین کی اور کسی طرح یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ ٹیلیگرام زرنجن پور کی راجکماری کلدیب کور نے بھیجا تھا۔“

زردار بیگ بولتے بولتے شاید کچھ تھک گیا تھا اس لیے رک کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

”مجھے کار سے کچلنے کی کوشش بھی تم ہی نے کی تھی؟“ میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

”ہاں۔“ زردار بیگ نے جواب دیا۔ ”لیکن تم کار کی ٹکر کھا کر بھی بچ گئے۔“

”یہ واقعہ بھی تفصیل سے بتاؤ! آخر میں سڑک پر پیدل کہاں جا رہا تھا؟“

”تم بھی کار ہی میں تھے اور میں تمہارے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ ایک جگہ کار روک کر تم اتر پڑے اور کھڑے ہو کر کسی ڈاکٹر کے کلینک کی طرف دیکھنے لگے جو سڑک کے پار تھا۔ تمہارے انداز سے ہچکچاہٹ صاف ظاہر ہو رہی تھی جیسے تم جانا بھی چاہتے ہو اور نہ جانے کا خیال بھی ذہن میں ہو۔ آخر تم نے جانے ہی کا فیصلہ کیا تم آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر سڑک پار کرنے لگے۔ میں قریب ہی کار روک کے موقع کی تاک میں تھا۔ یہ موقع ملتے ہی میں نے کار دوڑادی اور تمہیں کچل ڈالنا چاہا لیکن تم بروقت چونک پڑے اور پیہوں کے نیچے کچلے جانے سے صاف بچ گئے۔“

”اس کے بعد مجھے ہسپتال میں زہر دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ کام شاید اس بوڑھے نے اپنے کسی خاص آدمی سے لیا تھا۔ پھر کسی آدمی کو بم دے کر بھیجا گیا۔ اس آدمی کا بندوبست شاید تم نے ہی کیا تھا۔ کیوں؟“

”ہاں۔“

”کلدیہ کور کو بوڑھے ہی نے اغوا کیا ہے؟“

”ہاں۔“

”کس طرح! اس کی تفصیل بھی بتاؤ!“

”میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بوڑھے نے اس معاملے میں جادوگری دکھائی تھی۔ وہ حیرت انگیز قوتوں کا مالک ہے۔ یہ جادوگری نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ تنہا راج محل میں گھس کر کلدیہ کور کو وہاں سے نکال لایا مگر سب کا بیان یہی ہے کہ کسی نے اسے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”کلدیہ کے اغوا کا مقصد کیا ہے؟“

”اس کے بارے میں مجھ کچھ نہیں معلوم۔“

”کلدیہ اب کہاں ہے؟“

”اسی شہر میں جہاں بوڑھے کا قیام ہے۔“

”قیام کس جگہ ہے؟“

”میرے گھر میں۔“

”تمہارا گھر کہاں ہے؟“ میں کچھ جھنجھلا سا گیا۔

زرداد بیگ نے پتا بتایا جو میں نے ذہن نشین کر لیا۔ زرداد بیگ بدستور ساکت و صامت کھڑا ہوا تھا لیکن اس کے چہرے کی



رنگت اب بہت زیادہ پھکی پڑ چکی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آہستہ آہستہ اس کے جسم کا خون خشک ہوتا چلا جا رہا ہو۔ اب میں نے اس سے ایک نہایت اہم سوال کیا۔ ”کلدیہ کے سلسلے میں اب بوڑھے کیشپ کا کیا پروگرام ہے۔؟“

”مجھے اس کی تفصیل نہیں معلوم لیکن مجھے ان لوگوں کی باتوں سے کچھ ایسا اندازہ ہوا تھا جیسے وہ کلدیہ کو رولے کر کھٹنڈوروانہ ہونا چاہتا ہو!“ زرداد بیگ نے جواب دیا۔ اس کی آواز اب پہلے سے بھی زیادہ مدہم پڑ گئی تھی۔

اچانک مجھے ایک اور اہم بات یاد آئی اور میں اس سے اس کے بارے میں سوال کر بیٹھا۔ ”راج محل میں بوڑھے کیشپ کو پرتاب سنگھ کیوں سمجھا گیا تھا؟“

”مجھے اس کا علم نہیں۔“

”کیا میرا نام واقعی پرتاب سنگھ ہے؟“

”مجھے اس کا علم نہیں۔“

”اور.....“

لیکن اس سے پہلے کہ میرا فقرہ مکمل ہوتا، زرداد بیگ اچانک کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر پڑا۔ میں اس کے اس طرح گرنے پر بھونچکا رہ گیا تھا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی بھی نہیں۔ آخر کھڑے کھڑے اسے کیا ہو گیا تھا؟ میں تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اس کی آنکھیں اب بند ہو چکی تھیں اور چہرہ کسی مردے کی طرح سفید نظر آ رہا تھا میں نے اس کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکنیں محسوس کرنا چاہیں اور پھر یہ جان کر دم بخود رہ گیا کہ اس کی روح قفس غصری سے پرواز کر چکی تھی۔

حیرت انگیز، پراسرار ناقابل یقین سی موت تھی اس کی! میں چکرا کر رہ گیا۔ اس بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ دفعتاً ایک تیز قسم کی بوکمرے میں پھیلتی چلی گئی۔ میں نے چونک ادھر ادھر دیکھا اور جب میری نظریں دروازے کے طرف گئیں تو دروازے کے نچلے حصے سے کوئی سیال شے بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوتی نظر آئی۔

پیٹرول!..... میرے ذہن میں جھنکار سی ہوئی۔

کمرے میں پھیلنے والی بو پیٹرول ہی کی تھی۔ کوئی شخص کمرے میں پیٹرول بہا رہا تھا۔ میں نے بے تحاشا دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور اسے کھولنا چاہا لیکن وہ باہر سے بند تھا۔

”ارسلان!“ باہر سے ایک تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی۔

”دروازہ کھولو..... باہر کون ہے!“ میں دروازے کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہوا چیخ کر بولا۔

جواب میں ایک دھیمے سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ بڑا زہریلا قہقہہ تھا۔ اور پھر ایک کھرکراتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

”میں تمہاری موت ہوں ارسلان..... ویسے دوسرے لوگ مجھے مقدس کیشپ کہتے ہیں۔ تم مجھے بھول چکے ہو لیکن میں تو تمہیں



فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ آخر وہ وقت آئی گیا جب میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونیوالی ہے۔ پیٹرول اب تک سارے فلیٹ میں پھیل چکا ہوگا۔ بس اب اسے دیا سلائی دکھانے کی دیر ہے۔

میں اچھل کر پیچھے ہٹا میرے جوتے بھی پیٹرول میں بھیگ گئے تھے۔ گویا آگ لگتے ہی میرا اس کی زد میں آ جانا یقینی تھا۔ بوڑھے کیشپ کی آواز سنتے ہی مختلف النوع خیالات میرے دماغ میں ہجوم کر آئے تھے لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں اپنے ذہن کو ان سے الجھاتا۔ اس وقت تو میرے لیے سب سے بڑا سوال زندگی بچانے کا تھا۔

میرے لیے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ پیٹرول ہر طرف پھیل چکا تھا۔ دراصل میں نے اس کی بو کچھ دیر سے محسوس کی تھی۔ ”ارسلان!“ بوڑھے کیشپ کی گمبیر آواز سنائی دی۔ ”بہادروں کی طرح موت کا استقبال کرو۔“

میں تیزی سے اس دروازے کی طرف لپکا جس سے نکل کر زرداد بیگ میرے سامنے آیا تھا لیکن اس وقت میری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب وہ دروازہ ہاتھ روم کا ثابت ہوا۔ پیٹرول کی ایک دھار بہتی ہوئی ہاتھ روم میں بھی داخل ہو چکی تھی۔

کمرے سے میرے نکل جانے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کمرے میں ایک کھڑکی تو تھی لیکن اس میں بھی آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ اگر وہ گرل نہ ہوتی تو بھی اسے میرا نکلنا غیر ممکن ہی ہوتا کیونکہ میں تیسری منزل سے نیچے چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا۔

اتنی دیر میں پیٹرول کی دھاریں کمرے میں ہر طرف پھیل چکی تھیں۔ میری نظریں دروازے کے نچلے حصے پر جمی ہوئی تھیں اور میرے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

دروازے کے نچلے حصے میں ایک شعلہ سا لپکا اور میں سانس لینا بھی بھول گیا۔ پیٹرول میں آگ لگائی جا چکی تھی اور میں جانتا تھا کہ پیٹرول پر آگ لگائی جائے تو شعلے کتنی تیزی سے پھیلتے ہیں۔ دو سیکنڈ کے اندر اندر سارا کمرہ ایک دھپتا ہوا تنور بن جاتا۔

سفاک، بے رحم اور سنگدل، یعنی خوف و دہشت کی دیوی موت، میرے سامنے کھڑی تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ بے وفا، بیسوا زندگی مجھ سے منہ موڑنے کو ہے۔ چند لمحوں میں شیرازہ حیات بکھر جائے گا۔ میرے حواس اس عالم رنگ و بو کی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے حس ہو جائیں گے۔ خاک، خاک میں مل جائے گی۔ جہاں سے ابتدا ہوئی تھی، انجام بھی وہیں ہوگا۔

## داستان مجاہد

عظیم اسلامی ناول نگار نسیم حجازی کا ایک ایمان افروز ناول۔ مجاہدوں کی زندگی کی ایک مختصر سی جھلک۔ نسیم حجازی کے اسلامی ناولوں کی پہلی کڑی۔ یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔



اس وقت میرے جسم سے پھوٹ پڑنے والا پسینہ میرے انہی احساسات کا نتیجہ تھا۔ زندگی کتنی پیاری شے ہے؟ اس کا اندازہ ایسے ہی حالات میں ہو سکتا ہے لیکن اس عالم خردماں نصیبی میں بھی میرے ہوش و حواس زائل نہیں ہوئے تھے۔ بقا کی شدید خواہش نے میرے جسم میں بجلیاں سی بھردی تھیں۔ میں برقی سرعت سے دوبارہ اس دروازے کی طرف جھپٹا جو غسل خانے کا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال جز پکڑ چکا تھا کہ میں نل کھول کر اپنے کپڑوں کو پانی سے بھگولوں۔ پانی سے تر بہ تر کپڑے مجھے چند لمحوں کے لیے تو آگ کی ضرر رسانی سے محفوظ رکھ سکتے تھے میں نے سوچا تھا کہ بھیجے ہوئے کپڑوں کے ساتھ میں بیرونی دروازے کو توڑتا ہوا باہر نکل جاؤں گا۔ آگ میں جلتا ہوا دروازہ زیادہ مضبوط نہیں رہ جاتا اس لیے اسے ایک ہی دھکے میں توڑ دینا ممکنات میں سے تھا۔ چند فیصد امکانات تھے کہ اس طرح شاید میں بچ جاؤں لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ زندہ بچا ہوا وجود، اور جو کچھ بھی ہو، اپالو ہرگز نہیں ہوگا۔

اپالو، جو دیوتاؤں میں بھی حسین ترین دیوتا مشہور ہے۔

بھلا آگ کے شعلوں میں غسل کرنے کے بعد میرا چہرہ اس قابل کہاں رہ جاتا کہ مجھے اس دیوتا کے نام سے پکارا جاسکے لیکن اس وقت مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں اپنی بقا کی جنگ لڑنے پر آمادہ تھا اور شدید ترین خواہش یہ تھی کہ موت وزیت کی اس رس کشی کا نتیجہ میرے حق میں نکلے۔

میں نل کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھائی رہا تھا کہ اچانک مجھے ان خونی لمحات کے اعجاز کا احساس ہوا۔ میرے قدموں تلے بہتے ہوئے پیٹرول کی ٹھنڈک بدستور تھی۔ کمرہ جسے اب تک نار جہنم کی لپیٹ میں آ جانا چاہیے تھا، جوں کا توں تھا۔ آگ کے وہ شعلے جنہیں میرے گرد رقصاں ہونا چاہیے تھے۔ ابھی تک وجود میں نہیں آئے تھے اور یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ میں اسے وقت کا اعجاز نہ سمجھتا تو اور کیا سمجھتا۔ پیٹرول کی آگ کو پھیلنے میں اتنی دیر نہیں لگتی کیا میری بقا کی خواہش اتنی ہی شدید تھی کہ اس نے عناصر کے فطری عمل کو جامد کر دیا تھا؟ میں جلدی سے غسل خانہ چھوڑ کر کمرے میں نکل آیا۔ کچھ دیر پہلے مجھے دروازے میں جو شعلہ سا لپکتا نظر آیا تھا وہ اب مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میری عقل چکرا کر رہ گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے لپکتا ہوا شعلہ نہیں بلکہ اس کا صرف پرتو دیکھا تھا۔

اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ کمرے کے باہر، کوریڈور سے بھی آگے، شاید بیرونی دروازے کے پاس کچھ لوگ آپس میں برسر پیکار تھے۔ ”کچھ لوگ“ کے الفاظ میں بڑی احتیاط سے اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ان کی دبی دبی آوازوں اور کراہوں سے ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ یہ بات ممکنات میں سے تھی کہ وہ دو سے زیادہ ہوں اور یہ بھی ممکن تھا کہ صرف دو ہوں۔

مگر وہ کون تھے اور کیوں لڑ رہے تھے؟ میں اس سے بے خبر تھا باہر نکل کر ہی مجھے حقیقت حال معلوم ہو سکتی تھی ویسے بھی اس کمرے میں رکارہنا میرے لئے خطرناک تھا۔ پیٹرول کی دھاریں میرے ارد گرد بہہ رہی تھیں اور یہ بہتی ہوئی موت کسی وقت بھی میرا گلاد باسکتی تھی۔ مجھے جلا کر خاک کر سکتی تھی۔ لہذا اس سے پہلے کے وہ اعصاب شکن لمحات پھر لوٹ آئیں۔ مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ قسمت کی یاوری سے مجھے جو مہلت مل گئی تھی۔ اس سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہی ہوتی۔ میں نے بچاؤ کی اکلوتی تدبیر پر فوری عمل کی ٹھانی اور پوری



قوت کے ساتھ اس دروازے سے جا کر ایسا جو باہر نکلنے کی راہ میں آڑے آرہا تھا۔

اس دھکے سے دروازہ ہل کر رہ گیا۔ میں نے یہ عمل پھر دہرایا۔ پھر تیسری ضرب پر دروازہ چرچا کر رہ گیا۔ چوتھے دھکے نے اس کی چولیس کچھ اور ڈھیلی کر دیں۔ آخر پانچویں کوشش کامیاب ہوئی۔ دروازہ ٹوٹ کر دوسری طرف جاگرا۔ اس کی وجہ سے بہتے ہوئے پیٹرول کی چھینٹے اڑے۔ میں نے بیتابی سے باہر کی طرف جست لگادی تھی۔ میں پیٹرول کے چھینٹوں میں سے گویا اڑتا ہوا بیرونی دروازے تک جا پہنچا۔

کھلے ہوئے دروازے کے باہر ایک آدمی فرش پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ دوسرے آدمی کی صرف پشت دکھائی دی۔ وہ بڑی تیزی سے، نیچے جانے کے لیے زینے طے کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ بھاگ نکلنے کی فکر میں ہے۔ میں سوچے سمجھے بغیر اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ یہ میری اضطراری حرکت تھی۔ اس وقت مجھے قطعی نہیں معلوم تھا کہ میرے آگے آگے بھاگنے والی ہستی اسی بڑھے کی تھی جو نامعلوم وجوہات کی بنا پر ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا اور میری موت ہی اس کی وہ پیاس بجھا سکتی تھی جس کا سبب مجھے نہیں معلوم تھا۔

چند ہی لمحوں میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے آگے بھاگنے والا شخص، پھرتی اور تیزی میں کسی طرح بھی مجھ سے کم نہیں ہے۔ زینے ختم ہو گئے اور ہم بلڈنگ کے نیچے فٹ پاتھ پر پہنچ گئے۔ اس وقت اچانک بھاگنے والے نے مڑ کر مجھے دیکھا اور میں جھجک کر رہ گیا۔ میرے خیالوں میں بسا ہوا نفرت انگیز وجود میرے سامنے تھا۔ تصور میں بے ہوئے بوڑھے کی شخصیت کو، گوشت و پوست کی جیتی جاگتی، ہستی کے روپ میں پا کر، میرا ٹھکنا اور رکنا ایک فطری بات تھی۔ منحوس بوڑھے نے میری اس جھجک سے فائدہ اٹھایا اور بھاگتا چلا گیا۔ میں بھی جیسے خواب سے چونکا اور دوبارہ اس کے پیچھے لپکا مگر اب درمیانی فاصلہ کچھ اور بڑھ چکا تھا۔ بوڑھا ایک گلی میں گھس گیا اور جب میں بھی اس گلی میں داخل ہوا تو کف افسوس ملتا رہ گیا۔

گلی میں ایک کار کھڑی ہوئی تھی اور بوڑھا اس میں بیٹھ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کار کے قریب پہنچتا، وہ حرکت میں آگئی اور تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتی ہوئی گلی میں دوڑتی چلی گئی۔

بوڑھا کیٹپ، میرا جانی دشمن، میرے ہاتھ آتے آتے رہ گیا تھا۔ اس وقت میری بے بسی دیدنی تھی۔ کیٹپ کسی لیس دار مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسلا جا رہا تھا۔ اسی وقت طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں کار کی نمبر پلیٹ پر پڑ کر منعکس ہوئیں اور میرے ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔

کار کا نمبر..... مجھے وہ نمبر نوٹ کر لینا چاہیے تھا میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کلدیب کور کی وہ نوٹ بک نکالی جو مجھے اس کی خوابگاہ سے ملی تھی۔

کار گلی سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی لیکن مجھے اس کا نمبر اس طرح یاد ہو گیا تھا جیسے وہ ہمیشہ ہمیشہ سے میرے ذہن میں



ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اب میں اس نمبر کو کبھی نہیں بھول سکوں گا لیکن پھر بھی میں نے احتیاطاً نوٹ بک میں اس کا اندراج کر لیا۔

اب مجھے اس آدمی کا خیال آیا جسے میں پرکاش کے فلیٹ کے دروازے پر کراہتا چھوڑ آیا تھا۔ شاید اسی کی وجہ سے میری جان بچ گئی تھی۔ وہ کیشپ کو آگ لگاتے دیکھ کر اس سے بھڑ گیا ہو گا لیکن یہ معمہ میرے لیے لائنل ہی تھا کہ پیٹرول کی آگ کیسے بجھ گئی۔

میں تیزی سے واپس پرکاش کی بلڈنگ کی طرف چل پڑا۔ صبح کا اجالا سڑکوں پر پھیل گیا تھا اور اکاڈکارا بغیر نظر آنے لگے تھے۔ جب میں پرکاش کے فلیٹ پر پہنچا تو وہ آدمی کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو رہا تھا۔ اسے اپنی حالت کو سنبھالنے میں کافی دیر لگی تھی اس لیے میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیشپ کے بوڑھے جسم میں بلا کی طاقت تھی۔ اس نے اس بے چارے کو بری طرح رگڑ ڈالا ہو گا۔

پھر جب میری نظریں اس شخص کے چہرے پر پڑیں تو میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بلونت تھا۔!

”تم.....!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

بلونت نے ٹھنڈی سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا اور پھر بولا۔ ”اگر میں عین وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا تو تم اب تک کوئلے میں تبدیل ہو چکے ہوتے۔ اس کی انگلیوں میں دہنی ہوئی ماچس کی تیلی جل چکی تھی اور وہ اسے بتہے ہوئے پیٹرول پر پھینکنے ہی جا رہا تھا کہ میری آہٹ سن کر پلٹا۔ میں نے پیٹرول کی بوسونگھ لی تھی۔ اس لیے مجھے خطرے کا احساس پوری شدت سے ہو چکا تھا۔ میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ سب سے پہلے میں نے اس کے ماچس والے ہاتھ پر کلائی ماری تھی تاکہ تیلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ پیٹرول سے دور جا گرے، میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا لیکن اس بڑھے سے بھڑ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں کسی گھوڑے کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کم بخت میں بلا کی جان تھی۔“

بلونت بولتا رہا لیکن میرا ذہن اس سوال میں الجھ گیا تھا کہ مجھے پیٹرول میں آگ لگتی کیوں محسوس ہوئی تھی۔ میں نے جو شعلہ دیکھا تھا وہ کیا چیز تھی۔ کیا وہ ماچس کی تیلی کے شعلے کا عکس تھا جو پیٹرول کی سطح پر پڑ رہا ہو گا؟

”کہاں گھو گئے؟“ بلونت نے مجھے خیالات میں ڈوبا ہوا محسوس کر کے ٹوکا۔

میں چونک پڑا پھر میں نے بلونت کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”میرے دوست! میں یہ بات کبھی نہیں بھولوں گا کہ تم نے مجھے یقین موت سے بچایا ہے لیکن افسوس کہ تم اس شخص کو قابو میں نہ کر سکے جس نے کلدیب کو غائب کر دیا ہے۔“

”کیا..... کیا یہ..... بوڑھا.....؟“ بلونت ہلکا گیا۔

”ہاں“ یہ میرا دشمن جانی کیشپ تھا۔ اسی نے میرے نام پر راج محل سے کلدیب کو اغوا کیا تھا لیکن یہ باتیں تمہاری سمجھ میں اس وقت تک نہیں آئیں گی جب تک میں تفصیل سے نہ بتاؤں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم نیچے چل کر کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھیں۔ یوں بھی ہمارا یہاں کھڑا رہنا ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ صبح ہو چکی ہے اور دوسرے فلیٹوں سے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہونے ہی کو ہوگی۔ اگر ہم پکڑے گئے تو جان بچانا مشکل ہو جائے گی کیونکہ فلیٹ میں ایک بے ہوش آدمی کے ساتھ ایک لاش بھی پڑی ہوئی ہے۔“



”لاش!“ بلونت اچھل پڑا۔

”ہاں، بس اب جلدی سے نکل چلو کہاں سے۔“

ہم دونوں نے بڑی تیزی سے زینے طے کیے اور نیچے فٹ پاتھ پر پہنچ گئے۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے کونے کا ایک ریسٹورنٹ اس وقت کھولا جا رہا تھا۔ ہم دونوں وہیں پہنچ گئے۔ تمام میزیں ابھی خالی ہی پڑی ہوئی تھیں تاہم ہم نے کنارے ہی کی ایک میز منتخب کی۔ اس میز کے پہلو کی دیوار شیشے کی تھی جس سے پرکاش کی بلڈنگ صاف نظر آ رہی تھی۔

”کیا حقیقتاً اسی بڈھے نے راجکاری کو اغوا کیا ہے؟“ بلونت نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں..... اور کلہ یب اب بھی اسی کے قبضے میں ہے۔“

”تو پھر یہ بڑا اچھا ہوا کہ میں نے اسے دیکھ لیا۔ اب میں اسے پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“

”قرائن سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ نوبت شاید پاتال تک ہی پہنچے گی۔ کم بخت سانپ کی طرح تیز اور چیتے کی طرح پھرتیلا ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ حیرت انگیز قوتوں کا مالک بھی ہے۔ اس سے ٹکرانا آسان نہیں ہوگا۔ ویسے اس کا پتا چلانے کے لیے میرے پاس ایک سراغ ضرور ہے۔“

”کیا؟“ بلونت نے بیتابی سے پوچھا۔

”وہ ابھی ایک کار میں بیٹھ کر بھاگا تھا اور اس کار کا نمبر میں نے نوٹ کر لیا ہے۔“

”نمبر پلیٹ جعلی بھی ہو سکتی ہے۔“

”اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ یہ بات کیسپ کے سان وگمان میں بھی نہیں ہوگی کہ اسے اس طرح بھاگنا پڑے گا۔“

”وہ نمبر کیا ہے؟“

## ہٹلر

ہٹلر جیسی متنازع شخصیت پر اس کتاب کی تالیف کا مقصد روایتی انداز میں لکھی تاریخ سے ہٹ کر تاریخ میں نئے اور تجزیاتی (Analytical) زاویے روشناس کروانا اور آج کے قاری کو تاریخ کے موضوع کی وسعت کے بارے میں باور کروانا ہے۔ ہٹلر کی زندگی، اسکے فلسفہ، قوم پرستی اور ظلم و بربریت جیسے موضوعات پر ایک مفصل کتاب جسکی تالیف میں کئی ایک دیگر کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔..... ہٹلر کی تاریخ آپ کتاب گھر کے تحقیق و تالیف سیکشن میں جلد ہی پڑھ سکیں گے۔



میں نے اسے نمبر بتایا جو اس نے اپنے پاس نوٹ کر لیا۔

”لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ میں نے پوچھا۔

”مہاراج نے تمہیں راج محل چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن یہ ایک وقتی جوش کی بات تھی۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ راجگماری کی بازیابی کے لیے اکیلے سرمارنے کی بجائے تمہارا تعاون حاصل رکھنا زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ مہاراج کے خیالات کا یہ انقلاب محسوس کر کے میں نے کن کٹے دیو پر شاد پر تشدد کیا اور تمہارے شیعے کے مطابق اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اسے ہم کس نے دیا تھا۔ وہ بدقت تمام پرکاش کا نام اپنی زبان پر لاسکا۔ پھر اسے پرکاش کا پتا بھی بتانا پڑا یہاں میں اس توقع پر آیا تھا کہ پرکاش سے بہت کچھ معلوم کر سکوں گا اور چونکہ شاید تم بھی اس کی تاک میں ہو گے اس لیے تم سے بھی کسی نہ کسی طرح رابطہ قائم ہو ہی جائے گا۔“

بلونت خاموش ہو گیا کیونکہ ایک ویٹر قریب آ گیا تھا۔ میں نے اسے ناشتے کے سلسلے میں کچھ ہدایات دیں اور وہ مؤدبانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر چلا گیا۔

میں نے بلونت سے پوچھا۔ ”تم کار کے نمبر سے اس کے مالک کا پتا کتنی دیر میں چلا لو گے؟“

”ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔“

”ٹھیک ہے میں یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔“

”یہاں کیوں.....؟ تم راج محل.....“

”نہیں میں فی الحال وہاں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے کچھ سوچنے کے لیے تنہائی کی ضرورت ہے۔“

”جیسا تم مناسب سمجھو لیکن میں فون پر مہاراج کو اطلاع دے دوں گا کہ میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔“

”ہاں تم نے یہ نہیں بتایا کہ پرکاش کے فلیٹ میں لاش کس کی پڑی ہے؟ کیا تم نے پرکاش کو مار دیا؟“

”نہیں وہ دوسرا آدمی ہے۔“

اور پھر میں نے بلونت کو تفصیل سے بتایا کہ پرکاش کے فلیٹ میں کیا واقعات پیش آئے تھے لیکن میں اپنی اس حیرت انگیز قوت کا ذکر گول کر گیا جس سے میں نے زرداد بیگ کو حقیقت اگلنے پر مجبور کیا تھا۔

ویٹر ناشتہ لے کر آیا تو میں چپ ہو گیا۔ اس کے واپس جانے کے بعد ہم پھر گفتگو میں مصروف ہو گئے اور ناشتہ بھی کرتے رہے۔ میری تمام باتیں سننے کے بعد بلونت نے پر خیال انداز میں سر ہلایا اور پھر کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم اپنے ہی ملک میں راجگماری کو اس بڑھے کے نیچے سے نہ نکال سکتے تو ہمیں کھنڈ و تک اس کا پیچھا

کرنا پڑے گا۔!“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے جواباً کہا۔

اس کے بعد ہم نے ناشتے کے دوران میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سوچ میں گم تھے۔ ناشتہ کر چکنے کے بعد بلونت کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

”تو تم ایک گھنٹے بعد مجھے یہیں ملو گے؟“

”ہاں۔“

بلونت چلا گیا اور میں نے سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ میں ہلکے ہلکے کش لیتا ہوا اپنے خیالات میں غرق تھا کہ ایک منظر نے مجھے چونکا دیا۔ پرکاش کی بلڈنگ کے سامنے پولیس کی دو گاڑیاں آکر رُک چکی تھیں۔ پولیس ان گاڑیوں سے اتر کر بلڈنگ میں چلی گئی۔ دو ایک سپاہی باہر کھڑے رہ گئے۔ یہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا کہ بلڈنگ میں رہنے والے کسی شخص نے پیٹرول کی بوتلیوں کے پرکاش کے فلیٹ کی طرف توجہ دی ہوگی اور دروازے کو کھلا ہوا دیکھ کر اندر گھس گیا ہوگا۔ جب اسے لاش نظر آئی ہوگی تو اس نے شور مچا کر بلڈنگ کے دوسرے لوگوں کو جمع کیا ہوگا۔ پھر وہ سب مل کر اس فیصلے پر پہنچے ہوں گے کہ پولیس کو اطلاع دے دی جائے۔

اب میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ اس ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہوں یا اٹھ کر چلا جاؤں۔ دراصل خطرہ اس بات کا تھا کہ پولیس کا کوئی افسر تحقیقات کرتا ہوا اس ریسٹورنٹ تک بھی آسکتا تھا۔ تاہم یہ بات میری تقویت کے لیے کافی تھی کہ مہاراجہ شمشیر سنگھ کی وجہ سے میں کسی بڑی پریشانی میں نہ پڑتا۔ اسی تقویت کے سہارے میں ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہا۔ دراصل یہاں سے اٹھ جانے میں قناعت یہ تھی کہ میں نے بلونت سے یہیں منتظر رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

میں بیٹھا رہا، سگریٹ پھونکتا رہا اور زرداد بیگ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کھڑے کھڑے، میری باتوں کا جواب دیتے دیتے اچانک تڑ سے فرش پر گر اٹھا اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ میں نہ صرف مسحور کرنے کی طاقت رکھتا تھا بلکہ سحر زدہ افراد کے اعصاب میری اس قوت سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتے تھے اور بالآخر یہ ٹوٹ پھوٹ سحر زدہ شخص کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی کا شبات درہم برہم ہو جاتا تھا۔ موت اچانک اس کا مقدر بن جاتی تھی۔

لیکن میری اس پراسرار طاقت کا راز کیا تھا؟ مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مجھ میں یہ طاقت حال ہی میں پیدا ہوئی ہے یا بہت پہلے سے ہے۔

اسی ادھیڑ بن میں میرا ایک گھنٹہ گزر گیا۔ بلونت اپنے وعدے کے مطابق صحیح وقت پر لوٹ آیا۔ اس وقت بھی پرکاش کی بلڈنگ کے سامنے پولیس کی گاڑیاں موجود تھیں اور ظاہر ہے بلونت نے انہیں دیکھ لیا ہوگا لیکن اس نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں دیکھ کر اس پر کوئی ردِ عمل نہ ہوا ہو۔ شاید اسے پہلے ہی پولیس کی اس سرگرمی کا علم ہو چکا ہوگا۔ میں نے بھی اس سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں چھیڑی کیونکہ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وہ جو کچھ معلوم کرنے گیا تھا وہ معلوم ہو سکا تھا یا نہیں!



بلونت نے خیال ظاہر کیا کہ کھٹمنڈو کے سفر کا امکان بہت روشن ہو چکا ہے کیونکہ اس کار کا مالک صوبائی دارالحکومت میں رہتا تھا اور اس کا تعلق نیپال کے سفارت خانے سے تھا۔

”تو پھر ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہمیں اس وقت کوئی ٹرین مل جائے گی۔؟“

”ٹرین سے زیادہ تیز رفتار چیز جہاز ہے۔“

”کیا فوری طور پر کوئی فلائٹ مل سکے گی۔“

”مہاراج کا ذاتی بوئنگ موجود ہے اور اڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے بس مہاراج سے اجازت ملنے کی دیر ہے اور پھر ہم فضا میں ہوں گے۔“

بلونت نے اسی وقت ٹیلیفون پر راجہ شمشیر سنگھ سے رابطہ قائم کیا اور اسے صورتحال بتائی شمشیر سنگھ نے طیارے کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی اور کہا کہ وہ فوراً طیارے کے پائلٹ کو فون پر ہدایات دے دے گا۔

ہم دونوں ایک ٹیکسی کر کے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اچانک بلونت کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتا ہوا بڑبڑایا۔

”میری بھی مت ماری گئی ہے۔“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”تمہارے بیان کے مطابق زرداد بیگ نے تمہیں بتایا تھا کہ اس بوڑھے نے راجکماری کو اسی کے یعنی زرداد بیگ کے گھر میں رکھا تھا۔“

”ہاں تو پھر؟“

”ہمیں زرداد بیگ کا پتہ لگا کر وہاں چھا پہ مارنے چاہیے تھا۔“

”یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی لیکن میں تصنع اوقات سے بچنا چاہتا تھا۔“

”کیوں؟ کیا مطلب؟“

”بوڑھا کیشپ پرکاش کی بلڈنگ میں اپنے پھینکے ہوئے پانسے کو الٹا کرتے ہوئے دیکھ کر گیا تھا اس لیے یہ بات ممکن نہیں رہ گئی تھی کہ اس نے راجکماری کو زرداد بیگ کے گھر میں رہنے دیا ہو۔ اس نے راجکماری کو فوراً وہاں سے ہٹا دیا ہوگا اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ اس وقت راجکماری کو اپنے ساتھ لیے ہوئے، کسی راستے سے صوبائی دارالحکومت کی طرف رواں دواں ہو۔“

”تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں یوں نہیں سوچ سکا۔“ بلونت نے سر ہلایا۔

”اس موضوع پر بات یہیں ختم ہو گئی۔ جب ہم ہوائی اڈے پہنچے تو راجہ شمشیر کا بوئنگ جیٹ، پرواز کے لیے تیار تھا اور اس کے

پائلٹ کو ہمارے بارے میں ہدایات بھی مل چکی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم فضا میں تھے۔ ہم نے طے کیا کہ منزل پر پہنچ کر بلونت تو اس نیپالی افسر کے بارے میں چھان بین کرنے چلا جائے گا اور اس دوران میں اس ہوٹل کا رخ کروں گا جہاں میں اپنی یادداشت گم کرنے سے پہلے مقیم تھا اور جہاں زرداد بیگ نے اپنے بیان کے مطابق مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اس ہوٹل تک پہنچنا میرے لیے یوں ممکن تھا کہ اس کا پتا مجھے کلدیب کور کی ڈائری سے مل گیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے سوشل کماری سے بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل ہو چکی تھیں کیونکہ کلدیب کور کی طرف سے وہ ٹیلیگرام اسی نے ہوٹل کے پتے پر مجھے بھیجا تھا۔

بلونت سے پروگرام طے کرنے کے بعد میں نے نشست کے پچھلے حصے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ میری زندگی بھی کچھ عجیب طور سے رقص کننا ہے۔ چند دن میں مجھے اُن گنت حیرت انگیز واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا اور ابھی تک مجھے یہ بات نہیں معلوم ہو سکی تھی کہ میں کون ہوں۔ شاید اس ہوٹل سے مجھے اپنے بارے میں کچھ سراغ مل سکتا جہاں اب مجھے جانا تھا۔

اس شہر کی یاد کے واسطے سے مجھے ہسپتال کی نرس آسیہ یاد آئی جس نے ہسپتال سے فرار ہونے میں میری مدد کی تھی۔ شاید وہ پاگل لڑکی سچ میو کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی لیکن میں اس قسم کے جنجال میں پڑنے کا عادی نہیں تھا بس حسن سے سیراب ہونا میری فطرت تھی۔ اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا کہ میری یہ سیرابی ”حسن“ پر کیا کیا پھٹا ڈال سکتی ہے۔ میری اس فطرت کا سب سے بڑا ثبوت راجکماری کلدیب کور تھی جس کے بطن میں میری ”سیرابی کا حاصل“ پرورش پا رہا تھا۔ میری کوشش یہ رہی تھی کہ طب کا سہارا لے کر اس جھگڑے کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے لیکن راجکماری اپنی محبت کی اس نشانی کو ہر قیمت پر محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ شاید اس نے مجھے ٹوٹ کر چاہا تھا اور شاید میری زندگی میں داخل ہونے والی ہر لڑکی مجھے اسی طرح ٹوٹ کر چاہتی ہے لیکن میں اسے بے وقوفی سمجھتا ہوں۔ حاصل زندگی شادی تو نہیں!

آسیہ کے بعد میری زندگی میں سوشل کماری داخل ہوئی تھی۔ اس کے لمس آتشیں نے میرے دل کو برمایا تھا اور میں نے اس کے ساتھ بھی کیف و سرشاری کی منزلیں طے کی تھیں پھر میری ہی وجہ سے وہ موت کی آغوش میں جاسوئی تھی اور اس خوبصورت زندگی کے خاتمے پر میرے جذبات اُبل پڑے تھے لیکن میرے جذبات کی براہِ مستحجابی کا سبب یہ نہیں تھا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ نہیں اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ایک انسان کے سانسوں کا تار ٹوٹ گیا تھا۔ ایک نودمیدہ پھول، اجل کے آتشیں جھونکے کی زد میں آ کر جل گیا تھا۔ زندگی کی ایک مہک کم ہو گئی تھی اور مجھے زندگی سے پیار ہے۔ میں اس گلستان کی ایک ایک کلی اور ایک ایک غنچے کو مستی میں جھومتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ بھنورے اڑتے رہیں تتلیاں چکراتی رہیں اور پھول جھومتے رہیں۔ بس یہی میری خواہش ہے۔ میں اس فرحان و شاداں چمن کی کسی شاخ کو اجڑا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔

میں اپنے ان خیالات سے اس وقت چونکا جب بلونت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بتایا کہ طیارہ لینڈ کرنے والا ہے۔ ہوائی اڈے پر اترنے کے بعد ہم نے دو ٹیکسیاں کیں اور مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے ٹیکسی ڈرائیور کو ہوٹل کا



نام بتا دیا تھا اور ٹیکسی اس کی طرف رواں دواں تھی۔ لیکن اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہوٹل جانا مناسب بھی ہوگا یا نہیں؟ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ مجھے پہچانا جاسکتا ہے۔ اخبارات میری خاصی پبلیٹی کر چکے تھے۔ ”چونکہ میرا معاملہ ایک غیر معمولی نوعیت کا تھا اس لیے عام لوگوں کو بھی میری ذات سے دلچسپی ہو جانی چاہیے تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ اخبارات میں میری تصویر دیکھ کر ہوٹل کے منتظمین نے پولیس سے رابطہ قائم کر لیا ہو اور پولیس اچھی طرح میرے کمرے کی تلاشی لے چکی ہو۔ نیز یہ میرا سامان بھی اب پولیس بھی کی تحویل میں ہو۔ اس صورت میں اب مجھے اپنی ذات کا سراغ نہیں مل سکتا تھا۔ میری توقعات صرف سامان ہی سے وابستہ تھیں اور سامان تک رسائی نہ ہونے کی صورت میں مجھے کچھ نہیں معلوم ہو سکتا تھا۔

ٹیکسی ہوٹل کے پورٹیکو میں پہنچ کر رک گئی اور ڈرائیور نے انجن بھی بند کر دیا تھا لیکن میں تذبذب کے عالم میں بیٹھا ہی رہا۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اتروں یا نہ اتروں لیکن آخر کار میں نے خطرہ مول لینے ہی کا فیصلہ کیا۔ میں خود کو جاننے کے لیے اتنا ہی بے چین تھا کہ غیر یقینی خطرات میرے قدم کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتے تھے۔

میں نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے ٹیکسی رخصت کر دی اور ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ میں نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی تھی کہ میرا معمولی لباس اس ہوٹل کے شایان شان نہیں ہے۔ میں اب تک بدستور اسی لباس میں تھا جو میں نے ہسپتال سے فرار ہوتے وقت پہن رکھا تھا۔ ابھی تک مجھے اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی کہ اپنے لیے کسی ڈھنگ کے لباس کا بندوبست کر سکتا۔

میں ہال میں داخل ہوا میں نے اپنے انداز میں اتنا رعب پیدا کر لیا تھا کہ دربان مجھے روکنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ بس دیکھتا رہ گیا۔ میں کاؤنٹر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ریپشنسٹ مجھے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کے چونکنے سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں لیکن میں نے اپنے چہرے سے قلبی کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا اور خود کو مطمئن کرنے کے لیے سوچا کہ ریپشنسٹ مجھے دیکھ کر محض اس لیے چونکا ہوگا کہ میں بغیر کسی اطلاع کے کئی روز غائب رہنے کے بعد اچانک واپس لوٹا تھا۔

”چابی۔“ میں نے کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس نے خاموشی سے چابی نکال کر میری طرف بڑھادی۔ اسے مجھ سے کوئی سوال کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

”میرے لیے کوئی پیغام؟“ میں نے اس سے چابی لیتے ہوئے پوچھا۔

ریپشنسٹ نے ایک نظر اُن خانوں پر ڈالی جن پر کمروں کے نمبرز پڑے ہوئے تھے۔ میرے کمرے کے نمبر کا خانہ خالی تھا۔ ریپشنسٹ نے میری طرف متوجہ ہو کر ادب سے جواب دیا۔ ”جی نہیں۔“

اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مجھے پرتاب سنگھ کی حیثیت سے بہت کم لوگ جانتے ہوں گے ورنہ میری غیر حاضری میں ایک آدھ فون یا خط تو آتا۔

میں مزید کچھ کہے بغیر مڑ گیا۔ چابی پر میرے کمرے کا نمبر پڑا ہوا تھا۔ لہذا مجھے اس سلسلے میں کسی الجھن کا شکار نہیں ہونا پڑا۔ میں



آسانی سے اپنے کمرے تک پہنچ گیا جو تیسری منزل پر تھا۔

دروازے کا پہنی قفل کھولتے ہوئے میں نے بڑی بے چینی محسوس کی۔ ریپشنسٹ کی نظروں کا انداز میری خطرے کی حس کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خواہش ابھر رہی تھی کہ مجھے فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی ذات کی تلاش کا خیال بھی ذہن کے کسی گوشے میں کلبلا رہا تھا۔ اس کمرے میں مجھے کوئی ایسی چیز مل سکتی تھی جو میری گم گشتہ شخصیت کو روشنی میں لے آتی اور میں خود کو پالیتا۔

قفل کھل چکا تھا میں دروازے کو آہستگی سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے اندھیرے ہی میں دیوار کو ٹٹولا۔ سوکچل گیا اور میں نے اسے دبا کر کمرے میں روشنی کر دی۔ جو فرنیچر مجھے نظر آیا اس سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ کمرہ سنگ روم تھا۔ دیوان، صوفے اور آرام دہ کرسیاں! ٹیلی ویژن اور کتابوں کی شیلف! فرش پر نرم اور دبیز قالین! کمرے کی آرائش قیمتی اور دلکش چیزوں سے کی گئی تھی۔

میں چند قدم اٹھا کر کمرے کے وسط میں پہنچ گیا۔ وہاں رک کر میں گہری نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں اچھل پڑا میری نظریں بڑی تیزی سے آواز کی سمت گئیں اور میں نے دیکھا کہ اندرونی کمرے کا دروازہ اب کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے میں جو شکل نظر آئی وہ ایک لڑکی کی تھی۔ میرا منہ حیرت سے کھلا اور پھر کھلا ہی رہ گیا۔

### مشککہ

شکبہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گزشتہ کچھ سال سے ”ٹریک ٹو ڈپلومیسی“ کا غلبہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جوزنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن..... اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ”بھولے بادشاہوں“ کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانسی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ”را“ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے ایکشن ایڈونچر جاسوسی سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔



اندرونی کمرے میں تاریکی تھی اور اس تاریکی کے پیش منظر میں اس کا نیم برہنہ جسم اس طرح چمک رہا تھا جیسے وہ کوئی آسانی مخلوق ہو۔ لباس مغربی تراش کا تھا۔ نیکر سے ملتی جلتی کوئی مختصر چیز جس پر وہ اونی بنیان سے مماثل کوئی شے پہنے ہوئے تھی۔ اس لباس میں وہ کچھ ایسی دکھائی دے رہی تھی جیسے کچھ بھی پہنے ہوئے نہ ہو۔

میں نے اپنے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رنگتی محسوس کیں۔ وہ گدرا یا ہوا شباب ایسا ہی تھا کیہ جذبات کا الاؤ دہکا دے۔ مگر اس کیفیت کے باوجود میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا تھا کہ شاید کسی غلط کمرے میں آ گیا ہوں۔ میرے ذہن میں آیا کہ تیزی سے واپس لوٹ جاؤں لیکن اسی وقت وہ لڑکی بڑی بے تکلفی سے میری طرف بڑھتی ہوئی چھبائی۔

”ہیلو پرنس! مجھے یقین تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔“ وہ انگریزی میں بولی تھی اور اس کا لب وہ لہجہ بھی انگریزوں ہی جیسا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے جوابا کیا کہنا چاہیے۔ وہ بڑی ادا سے چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ اس نے اتنے ہولے ہولے قدم اٹھائے تھے جیسے اس کی پیروں تلے دھرتی کا کلیجہ دھڑک رہا ہو۔ اس کے خوبصورت جسم کی ہلکی ہلکی جنبشوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے دل کی بستی میں شفق کے رنگ پھلنے لگے ہوں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اسے دیکھتے ہوئے میری نظروں میں جو کیفیت ابھر رہی تھی۔ وہی عالم سرمستی اس کی نظروں میں بھی تھا۔

”تم..... کون ہو؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ اب اتنی قریب آ گئی تھی کہ اس کے جسم کی مہکار میری مشام جاں کو معطر کرنی چلی گئی۔

”ارے! بھول گئے؟“ وہ اٹھلا کر بولی۔ ”ابھی تین چار دن کی تو بات ہے کہ ایک بد معاش نے یہاں کمرے میں گھس کر تم پر گولیاں چلائی تھیں۔ اگر میں عین وقت پر نہ آ گئی ہوتی تو شاید.....“

”اچھا تو وہ تم ہو۔“ میں نے اسے اور زیادہ غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم شاید میرے برابر والے کمرے میں مقیم تھیں“

میری روم میٹ تو نہیں تھیں۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے ہنسنے کا انداز بھی دل کو لبھا لینے والا تھا۔ دلفریب اور کھٹکھٹاتی ہوئی وہ ہنسی ایسی تھی جیسے بے شمار فحان اس طرح ٹوٹے ہوں کہ ان کی چھوٹی چھوٹی کرچیں ہر طرف بکھر گئی ہوں۔ میں نے ان کرچوں کی لذت انگیز چھن اپنے دل پر محسوس کی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ”بیشک میرا قیام تمہارے برابر والے کمرے میں تھا اور میں اب بھی وہیں مقیم ہوں لیکن اگر تم غائب نہ ہو گئے ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ میں اب تک تمہاری روم میٹ بھی بن چکی ہوتی۔“ اس نے بڑی بیباک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان نظروں میں بھوک تھی۔ شدید بھوک، جنم جنم کی بھوک!

”لیکن اس وقت تم میرے کمرے میں کیسے آ گئیں؟“ میں بولا لڑکی نے مڑ کر خوابگاہ کی طرف دیکھا اور پھر سرسراتی ہوئی آواز



میں کہا: ”کیا ہم یہ سب باتیں آرام دہ ماحول میں بیٹھ کر نہیں کر سکتے۔؟“

”کیا یہاں کا ماحول آرام دہ نہیں؟“

”وہاں زیادہ آرام دہ ہوگا۔“ وہ خوابگاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنس پڑی۔

میرے قدم بے اختیار دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئے شاید میرے لاشعور میں بھی نشہ انگیز خواہشات کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ ایک خوابناک سا چہرہ اپنی تمام فسوں کاریوں کے ساتھ میرے تصور میں لہرا گیا۔ بوڑھے کیشپ کے علاوہ یہی ایک نسوانی چہرہ ایسا تھا جو کئی مرتبہ میرے تصور میں آچکا تھا۔ یقیناً اس کا تعلق میرے ماضی سے ہوگا۔ اس چہرے کو دیکھ کر میرے جذبات کی آگ کچھ اور سوا ہو جاتی تھی۔ اعصاب پر نشہ سا چھانے لگتا تھا اور تصور کے پردے پر شفق کے پیش منظر میں پریاں سی ناچتی نظر آنے لگتی تھیں دہکتے ہوئے شباب سے بھر پور جوانیاں!

میرے پیچھے پیچھے وہ خوابگاہ میں داخل ہوئی اور پھر مجھ سے آگے بڑھ کر سیدھی بستر پر جاگری۔ اس کی ایک ایک ادا میں دعوت پنہاں تھی۔ ایسی بیباک لڑکیاں میری زندگی میں شاذ ہی آئی ہوں گی۔

میں اس کی دعوت پر لبیک کہنے سے قبل اس کمرے میں اس کی موجودگی کا راز جاننا چاہتا تھا اس لیے میں بستر کے قریب بھی نہیں گیا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”ہاں اب بتاؤ! تم اس کمرے میں کیسے آئیں جبکہ دروازہ مقفل تھا۔“

”پہلے تم یہ بتاؤ کہ اتنے دن تک غائب رہے اور تمہارے ساتھ کیا واقعات پیش آئے۔“

یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا اس لیے میں خاموش رہا۔

لڑکی پھر بولی۔ ”اخبارات کا میں بہت غور سے مطالعہ کرتی ہوں اس لیے مجھے معلوم ہے کہ تم ایک کار کے حادثے میں زخمی ہو کر ہسپتال پہنچے تھے۔ وہاں کسی نے تمہیں ہلاک کرنے کے لیے ڈلیڈ بم استعمال کیا تھا۔ پھر تم ہسپتال سے بھاگ نکلے تھے اور تم نے زرنجن پور کی راہ لی تھی۔“

میں چونک پڑا کیونکہ اخبارات میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے زرنجن پور کا رخ کیا تھا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں زرنجن پور گیا تھا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

لڑکی اچانک بستر پر اندھمی ہو کر لیٹ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی جسم میں بجلیاں بھری ہوئی ہوں۔ اس کا چہرہ میری طرف تھا۔ اس نے کہیاں بستر پر نکا کر ہتھیلیاں اپنی تھوڑی کے نیچے رکھ لی تھیں۔ اس انداز میں لیٹنے کے باعث اس کی بنیان کا گلا کچھ لٹک گیا تھا اور اس کے کھلے ہوئے حصے سے گردن کے نیچے کا حصہ صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ جسمانی خطوط، وہ گدارے ہوئے ہلال دیکھ کر میری آنکھوں میں انگارے سے دہکنے لگے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے حلق میں کوئی کانٹا ٹوٹ گیا ہو۔ اس تیز و طرار لڑکی نے شاید میرے جذبات کی بڑھتی ہوئی تپش کو میرے چہرے پر محسوس کر لیا تھا اس لیے اب وہ کچھ ایسے انداز میں مسکرا رہی تھی جیسے سمجھ رہی ہو کہ



عنقریب مجھ پر فتح پالے گی۔

”یہ کوئی ایسا الجھا ہوا مسئلہ نہیں تھا۔“ وہ میرے سوال کے جواب میں بولی۔ ”میں نے اخبارات میں یہ بھی پڑھا تھا کہ نرنجن پور کے راجہ شمشیر سنگھ نے ہسپتال پہنچ کر تمہارے بارے میں چھان بین کی تھی۔ وہ وہاں ایک فرضی داستان بنا کر بھاگ لیے تھے لیکن میں اتنی بدھونیں ہوں کہ اس پر یقین کر لیتی۔ میں سمجھ گئی کہ تم نے ضرور کسی نہ کسی وجہ سے راجہ شمشیر سنگھ تک رسائی حاصل کی ہوگی میرے اس خیال کو تقویت اس دھماکے سے پہنچی جو راج محل میں ہوا تھا اور جس کی خبر آج کے اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ دھماکہ بھی تمہارے ہی لیے ہوگا۔ میں نے سوچا کہ اب تم وہاں بھی نہیں رکو گے اور شاید یہیں واپس لوٹو۔“

”میں اس دھماکے سے مر بھی تو سکتا تھا تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ میں مر گیا ہوں گا۔“

”اخبارات میں صرف ایک لڑکی کے مرنے کی خبر تھی۔“

میں ابھی اس نکتے پر لڑکی سے بحث جاری رکھ سکتا تھا لیکن میرا ذہن اس پریشانی میں الجھ گیا کہ جب اس لڑکی نے اخبارات میں میری تصویر دیکھ کر مجھے پہچان لیا تھا تو یقیناً ہوٹل کے منتظمین بھی بے خبر نہیں ہوں گے۔ ہوٹل کے اس ریپشنسٹ نے بھی مجھے پہچان لیا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ وہ پولیس کو میری واپسی کے بارے میں اطلاع دے چکا ہو۔ ایسی صورت میں پولیس کو لازماً یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ممکن ہے وہ پہنچنے ہی والی ہو۔

”کہاں گھوم گئے تم؟“ لڑکی اٹھلا کر بولی۔

”آں!“ میں چونک پڑا اور پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس کمرے میں کیسے آئی

ہو۔؟“

”لیکن ابھی تم کچھ اور سوچ رہے تھے۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہیں پولیس کی آمد کا دھڑک لگا ہوا ہے اور یہ دھڑک کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ پولیس اب پہنچنے ہی والی ہے۔“

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ یہ خیال میرے ذہن میں بڑی تیزی سے ابھرا تھا کہ شاید یہ لڑکی پولیس کی جاسوس ہو مجھے باتوں میں الجھائے رکھنے سے اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اتنی دیر میں پولیس پہنچ جائے۔

”ارے ارے! کیا ہوا؟“ وہ بھی جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

”غلط نہ سمجھو! پولیس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ حرافہ، حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی ذہین بھی تھی۔ اس نے میرے چہرے سے پڑھ لیا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی اور میں اچھل پڑا۔

”پولیس۔“ لڑکی میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں مسکرائی۔  
میں ہونٹ بھیج کر اسے گھورنے لگا۔

لحاتی وقفے کے بعد دستک پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی چیخ کر کہا گیا۔

”قانون کے نام پر دروازہ کھول!“ یہ آواز میرے لیے جانی پہچانی تھی۔

”انسپکٹر جوگیندر!“ لڑکی میری طرف دیکھتی ہوئی پہلے ہی کے سے انداز میں مسکرائی۔

”لیکن میں گرفتار ہونے سے پہلے تم کو تہاری چالبازی کی سزا ضرور دوں گا۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔

اسی وقت جوگیندر کی آواز پھر سنائی دی۔ ”اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو میں اسے توڑ دوں گا۔“

لیکن میں جانتا تھا کہ دروازہ توڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ہوٹل کا کوئی نہ کوئی کارندہ ”ماسٹر کی“ سے دروازہ کھول دیتا۔ عین ممکن تھا کہ کسی شخص کو ”ماسٹر کی“ لینے کے لیے منجر کے کمرے کی طرف دوڑا دیا گیا ہو۔

مجھے اس حسین ناگن پر بڑے زور کا غصہ آرہا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اسے گردن سے پکڑ لینا چاہا مگر وہ بلا کی پھرتیلی بھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اس قسم کے حالات سے نپٹنے کے لیے باقاعدہ تربیت حاصل کی ہو۔ وہ مجھ سے چند فٹ دور کھڑی تھی اور اب اس کا چہرہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

”بے وقوفی کی حرکتیں نہ کرو!“ وہ بولی۔ ”میں تم کو پولیس سے بچا سکتی ہوں۔“

میں اب اس کے کسی جال میں پھنسا نہیں چاہتا تھا اور اس کو سزا دینے کے چکر میں خطرات میرے سر پر پہنچ سکتے تھے اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کسی طرح یہاں سے بھاگنے کی فکر کرنا چاہیے۔ میں ایک دم گیلری کی طرف جھپٹا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ بعض ہوٹلوں کی گیلریوں میں گول زینے بھی بنا دیے جاتے ہیں تاکہ آگ لگنے کی صورت میں یا کسی دوسری قسم کے خطرے کے موقع پر اس طرف سے نکلا جاسکے۔

میرا خیال درست ثابت ہوا۔ گیلری میں آہنی گول سیڑھی کا دروازہ موجود تھا۔ اسے کھولنے کے لیے میں نے کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ پیچھے سے لڑکی نے میرا دوسرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا۔

”میرا خیال تھا کہ تم بے حد ذہین ثابت ہو گے لیکن تم حماقت پر حماقت کیے جا رہے ہو۔“ وہ بولی۔ ”کیا تم پولیس کو اتنا ہی احمق سمجھتے ہو کہ اس نے عقبی راستے کو نظر انداز کر دیا ہوگا؟ زینے کے اختتام پر تمہیں کم از کم دوکانسٹبل ضرور ملیں گے۔“

لڑکی کی یہ بات وزن رکھتی تھی۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ کوئی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ یہ لڑکی میرے لیے ایک معمہ بنتی جا رہی تھی۔  
”ادھر آؤ..... میرے ساتھ..... غسل خانے میں۔“ لڑکی نے مجھے گھسیٹنا چاہا۔



غسل خانے کا نام آتے ہی مجھے خیال آیا کہ ادھر سے فرار ہونا ممکنات میں سے تو ہے۔ اکثر ہوٹلوں میں دو کمروں کے لیے ایک مشترکہ غسل خانہ ہوتا ہے اور چونکہ برابر والا کمرہ اس لڑکی کا تھا اس لیے یہ بات سوچی جاسکتی تھی کہ وہ خود بھی اسی راستے سے میرے کمرے میں آئی ہوگی۔

میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور وہ مجھے گھسیٹتی ہوئی غسل خانے میں لیے چلی گئی۔ دوسری طرف کی دیواریں واقعی ایک اور دروازہ موجود تھا۔ جو لڑکی کے ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی دوسری طرف کھلتا چلا گیا۔

لڑکی مجھے اس طرف لیجاتی ہوئی بولی۔ ”یہ دروازہ اس طرف سے لکڑی کی مضبوط پٹیاں لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔“

لڑکی کی بات صداقت پر مبنی تھی۔ مجھے اس طرف لکڑی کی پٹیاں ایک طرف رکھی نظر آئیں جن کو اسکر یو سے کھول کر بڑی خوبصورتی سے الگ کر لیا گیا تھا۔ اب اس چلتا پرزہ قسم کی لڑکی نے جلدی جلدی وہ پٹیاں پھر اسی جگہ لگا دیں جہاں سے انہیں اکھاڑا گیا تھا۔ ”اب تم محفوظ ہو۔“ وہ کہتی ہوئی بڑی تیزی سے میری طرف مڑی اور میں جھجک کر رہ گیا کیونکہ اس کا سینہ میرے سینے سے ٹکرا گیا تھا۔ ایک برقی رو میرے سارے جسم میں دوڑتی چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے لڑکی نے ایک ایسی حرکت کی کہ میرا تمام جسم مسلسل جھنجھانے لگا۔ برقی روئیں سر سے پیر تک اور پیر سے سر تک دوڑنے لگیں۔ وہ مجھ سے لپٹ پڑی تھی۔ اب میرے صبر و ضبط کا دامن بھی تار تار ہو گیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری گردن میں ڈال دیے اور اپنے سگلتے ہوئے ابھرے ابھرے سے ہونٹ میرے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ اس کا جسم میرے بازوؤں میں چکنی مچھلی کی طرح پھسل رہا تھا۔ میں اسے اٹھائے ہوئے بستر کی طرف بڑھا۔ اس وقت سارے خطرات، ساری پریشانیاں، دھواں بن کر میرے ذہن سے اڑ چکی تھیں۔

”انسپکٹر جوگیندر اور پولیس میرے لیے ایک بے معنی سی بات بن چکی تھی۔“

”تمہارا نام کیا ہے خوبصورت فتنے!“ میں نے سرگوشی سی کی۔

”سلویا۔“ اس نے بھی جذبات سے بوجھل سرگوشی کی۔

ہم دونوں کے بوجھل جذبات رنگ پر آچکے تھے۔ شوخ رنگوں کی برسات ہو رہی تھی۔ ہم اس برسات میں بھیگتے چلے گئے۔ ہمارے ایک ایک مسام پر جیسے پھواریں پڑ رہی تھیں۔ سلویا کی بیباکی اور سرکشی اس طوفان رنگ و نور کو تیز سے تیز تر کرتی چلی گئی۔ ہم کیف و انبساط کی لہروں پر تیرتے چلے گئے۔ ان متموج لہروں سے کھیلنا میری عادت تھی لیکن میں اب نارمل نہیں تھا۔ شور مچاتی ہوئی لہروں نے آخر مجھے نڈھال کر دیا لیکن سلویا اب بھی پہلے ہی کی طرح بیتاب اور پر جوش تھی وہ اب بھی ان لمحات کی لذتوں کو نچوڑنے پر آمادہ تھی۔ اسکا انداز قبل از تاریخ کی وحشی عورتوں کا تھا۔ اتنی ابنا رمل عورت میری زندگی میں کبھی نہیں داخل ہوئی۔ میں بہر طور اسکا ساتھ دینے سے قاصر تھا لیکن وہ مجھ سے کھیلتی رہی۔ مجھے جھنجھوڑتی رہی اور آخر کار میں پھر اس طوفان میں ہاتھ پاؤں پھینکنے لگا۔ ایک بار پھر ان سرکش لہروں سے ٹکرانے لگا۔ سلویا کا جسم پسینے پسینے ہو چکا تھا اور اب اسکے بدن سے ایک عجیب سے مہک اُٹھ رہی تھی جس نے میرے جذبات کو ہمیز کیا تھا۔



طوفان کا دورانی بھی گزر گیا۔ اب سلویا بھی کیف و انبساط کی ان لہروں پر تیرتے تیرتے تھک چکی تھی۔

اچانک بیرونی دروازے پر دستک سنائی اور پھر انسپکٹر جوگیندر کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”دروازہ کھولے!“

مجھے اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا جسم ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا ہو لیکن جوگیندر کی آواز پہچانتے ہی میرے جس میں جیسے بجلیاں دوڑنے لگیں۔ میں نے بڑی تیزی سے اٹھنا چاہا لیکن سلویا نے مجھے روک دیا۔

”لینے رہو..... تمہیں اٹھنے کی ضرورت نہیں ہیں اس الو کے پٹھے سے نپٹ لوں گی۔“

سلویا بڑے جھلائے ہوئے انداز میں بستر سے نکلی تھی۔ یہ دخل دینے والی سے بری طرح کھل گئی تھی۔ اس وقت اس نے لباس کا منت کش ہونا غیر ضروری سمجھا اور ایک چادر سے اپنے جسم کو کچھ دکھاتی کچھ چھپاتی ہوئی سنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ میں دوسری چادر اوڑھے بستر پر لیٹا رہا لیکن یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ مجھ سے غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ میں اب بھی سلویا پر اعتماد کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور پھر میں جوگیندر کو کہتے سنتا۔

”معاف کیجیے گا مادام! ہمیں شبہ ہے کہ ایک مفروضہ ملزم.....“

لیکن سلویا نے اس کا فقرہ پورا نہیں ہونے دیا۔ اس نے ”مادام“ کو ایک گندی سی گالی دی اور پھر مفروضہ ملزم کی ماں بہنوں کی شان میں کچھ قصیدے جزدیے۔ اس وقت مجھے یہ گالیاں بری نہیں لگیں اور میں دل ہی دل میں ہنس دیا۔ اس لڑکی کی بیباکی پر عیش عیش کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا تھا۔

”تم لوگ کسی تھکے ماندھے جسم کو آرام بھی نہیں کرنے دیتے۔“ سلویا نے کہا۔ ”جاؤ! بھاگ جاؤ! مجھے پریشان نہ کرو۔“

میں بیساختہ مسکرا دیا مجھے یقین تھا کہ سلویا نے پہلا فقرہ کہتے ہوئے اپنے تھکے ماندے جسم کی ایک آدھ جھلک جوگیندر کو بھی دکھائی ہوگی کیونکہ جب جوگیندر بولا تو اس کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔

”معاف کیجیے گا مس.....! ہم صرف ایک نظر غسل خانے کے اس دروازے کو دیکھنا چاہتے ہیں جسے آپ کی طرف سے لکڑیاں لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔“

”ضرور دیکھو لیکن میں اس وقت آرام کر رہی ہوں اور آرام کرتے وقت مجھے کسی بھی قسم کا کپڑا اپنے جسم پر رکھتے ہوئے الجھن ہوتی ہے۔ اگر تمہیں میرے آرام کرنے کے اس انداز پر اعتراض نہ ہو تو اندر آ جاؤ۔!“

میں نے سلویا کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ خوابگاہ کی طرف لوٹ رہی تھی۔ میں اس کی دیدہ دلیری پر عیش عیش کیے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اب جوگیندر خوابگاہ میں آنے کی ہمت کرے گا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا..... جوگیندر کی آواز سنائی۔

”سس..... سنیے مس!..... شکریہ!..... آپ تو مطمئن ہیں نا کہ کوئی اس طرف سے آپ کے کمرے میں داخل نہیں ہوا؟“

”میں تین گھنٹے سے بستر پر ہوں اور اس دوران میں کوئی ادھر نہیں آیا۔ ویسے بھی اس راستے پر لکڑی کی پٹیاں لگی ہوئی ہیں۔“



”اگر آپ مطمئن ہیں تو پھر ہمیں اندر آ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں شکریہ.....! آپ دروازہ بند کر لیجیے۔!“

سلویا کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ شاید وہ پولیس کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اس نے بڑی پر شور آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔ سلویا نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ جو گیندر کو بے وقوف بنا دیا تھا لیکن میری یہ الجھن بدستور قائم تھی کہ آخر یہ لڑکی ہے کون؟ یہ میری ذات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟ اس کا سبب محض یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ میرے وجود سے اپنی تشنہ لبی کو سیراب کرنا چاہتی ہو۔!

وہ ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے کارنامے پر کوئی تبصرہ کرتی میں نے اس سے کہا۔

”اب مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے کیا تم میرے لیے کھانے کا بندوبست کر سکتی ہو۔“

”بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے لیکن میں نے دو آدمیوں کے لیے کھانا منگوایا تو ہونٹ والے شبہات کا شکار ہو سکتے ہیں بہتر ہوگا

کہ میں کھانے کے لیے اتنا ہی منگواؤں جتنا ایک آدمی کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔“

”پھر تم کیا کرو گی؟“

”میں باہر جا کر کھالوں گی۔“

وہ ایک معقول قسم کا لباس پہن کر کھانے کا بندوبست کرنے چلی گئی۔ میں نے بستر چھوڑ دیا اور کپڑے پہن کر ایک کرسی پر بیٹھ

گیا۔

”دو پہر ڈھل چکی تھی۔ سہ پہر کا آغاز ہونے والا تھا۔ گویا اب مجھے چار گھنٹے اور گزارنا تھے۔ اس کے بعد میں پھر ہوائی اڈے کا

رخ کرتا۔ وہیں کے ایک ریسٹورنٹ میں بلونت سے ملاقات ہونا طے پایا تھا۔

لیکن اس وقت میرے ذہن میں بلونت کا خیال تھا نہ ہوائی اڈے کا! میں صرف سلویا کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کے

خوبصورت بدن کے بارے میں نہیں بلکہ اس کی پراسرار شخصیت کے بارے میں وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی اور مجھ سے اس مڈ بھیڑ کا

مقصد کیا تھا؟ یہ سوالات میرے ذہن میں چکرارہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ کھانے کے ساتھ لوٹی۔ سروس بوائے کھانے کی ٹرے سنگ روم میں رکھ کر چلا گیا تو سلویا نے مجھے آواز دی۔

میں ننگے پیر دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں نے ابھی جوتے نہیں پہنے تھے۔

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانے کے بعد میں نے چائے بنائی اور اس وقت وہ بولی۔

”تم نے ہسپتال میں اپنا نام اپالو کیوں رکھ لیا تھا؟“

”اس لیے کہ مجھے اس وقت اپنا کوئی نام بھی نہیں معلوم تھا۔“

”کیا مطلب!“ وہ قدرے استعجاب میں بولی۔ ”تو کیا واقعی تم اپنی یادداشت گم کر چکے ہو؟“

”اگر تم نے اس حادثے میں اپنا ماضی فراموش کر دیا تھا تو پھر اس ہوٹل تک کیسے آ گئے؟“

”مجھے زنجن پور ہی میں اپنے متعلق کچھ باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک بات یہ تھی کہ میرا نام پر تاب سنگھ ہے لیکن مجھے

اس نام پر بھی یقین نہیں۔ شاید میرا اصل نام ارسلان ہو۔“

بوڑھے کیٹپ نے مجھے اسی نام سے مخاطب کیا تھا اور میری انگلی پر بنے ہوئے ”اے“ سے بھی اس کی گواہی ملتی تھی، تاہم مجھے مکمل یقین نہیں تھا کہ میرا نام یہی ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ بھی فرضی ہی ثابت ہوتا۔

سلویا اچانک کسی سوچ میں پڑ گئی تھی۔ وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”تمہاری مردانہ جاہت نے مجھے اتنا متاثر کیا ہے کہ میں کچھ لاپرواہ ہو گئی تھی پہلے مجھے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیے تھا کہ تم وہی شخص ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”مطلب ابھی سامنے آ جائے گا۔ ذرا اپنا دایاں پیر اوپر اٹھاؤ!“ سلویا نے کہا اور پھر انتظار کیے بغیر خود ہی جھک کر میری دائیں ٹانگ پکڑ لی اور اسے اوپر اٹھایا۔ چائے کی پیالی جو میرے ہاتھ میں تھی گرتے گرتے بجی۔.....!

”ارے ارے یہ تم کیا کر رہی ہو!“ میں جلدی سے چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی۔

سلویا نے میرے احتجاج کو نظر انداز کر دیا اور میرے تلوے کو روشنی کی طرف کر کے غور سے دیکھنے لگی۔ میری پوزیشن اس وقت بڑی مضحکہ خیز تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbook

”ارے چھوڑو میری ٹانگ۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔

اس نے فوراً میری ٹانگ چھوڑ دی اور مجھے پھر ایک جھٹکا لگا۔

## باسکرولی کا آتشی کتا

کتاب گھر آپ کے لئے لایا ہے مشہور سراغ رساں شرلاک ہومز کا ناول ”باسکرولی کا آتشی کتا“۔ یہ ناول مشہور راسٹر سر آر تھر کونن ڈائل کی شہرہ آفاق کتاب ”The Hound of Baskervilles“ کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۹۰۲ء میں تحریر کئے گئے اس ناول پر اب تک ہالی وڈ کی کئی فلمیں اور ڈرامے بن چکے ہیں۔ سر آر تھر نے شرلاک ہومز کا کردار اٹھارویں صدی میں متعارف کروایا تھا لیکن اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کر لیں کہ ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود یہ کردار جاسوسی ناول پڑھنے والوں میں آج بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ اس ناول کو کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔



”اب میں تمہیں بہت کچھ بتا سکوں گی۔“ سلویا نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تم وہی شخص ہو جس کی تلاش میں مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔ میرا تعلق برٹش انٹیلی جنس سے ہے۔ ایک ہفتے پہلے مجھے لندن میں یہ کام سونپا گیا تھا کہ میں اس شہر میں پہنچ کر تمہیں تلاش کروں اور کسی بھی طرح یہاں سے لندن لے جاؤں جہاں ملکہ اور ان کے شوہر ذاتی طور پر تم سے ملاقات کے متمنی ہیں۔“

”اوہ!“ میرے منہ سے بمشکل نکل سکا حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئی تھیں اور اپنی شخصیت کے اس بڑھتے ہوئے اسرار سے ذہن چکرا کر رہ گیا تھا۔ بھلا الزبتھ اور فلپ کو مجھ سے ملاقات کرنے کی کیا پڑی تھی؟

اچانک مجھے ایک ایسی بات کا احساس ہوا کہ میں دم بخود رہ گیا۔ میں ملکہ اور اس کے شوہر کے متعلق ان کے پہلے ناموں کے توسط سے سوچ رہا تھا جیسے میں انہیں ان کے تعظیمی ناموں کے بجائے انہی ناموں سے پکارتا رہا ہوں۔ کیا میں واقعی اپنے ماضی میں ان سے اتنا بے تکلف رہا تھا کہ انہیں ان کے القابات سے پکارنے کی بجائے ان کے ناموں سے مخاطب کروں؟

”کہاں کھو گئے؟“ سلویا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ ”سوچ رہا تھا کہ تمہاری ملکہ اور ان کے شوہر کو مجھ سے ملاقات کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔“

”ہو سکتا ہے تم ان کے دوستوں میں سے ہو!“

”کیا وہ اپنے دوستوں کی تلاش میں برٹش انٹیلی جنس کو بھی استعمال کر سکتے ہیں؟“

”یہ بات واقعی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے ممکن ہے تمہاری تلاش کا کچھ اور سبب بھی ہو۔ اب تم یہ بتاؤ کہ لندن چلنے پر آمادہ ہو یا نہیں؟ اگر تم واقعی اپنی یادداشت کھوپکے ہو ظاہر ہے وہاں پہنچ کر تمہیں اپنے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔“

”کیا تمہیں میرا نام نہیں بتایا گیا تھا؟“

”نہیں صرف تفصیلی حلیہ بتایا گیا تھا۔ اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ تم یہاں کے کسی فرسٹ کلاس ہوٹل میں مقیم ہو گے۔ تمہاری خاص شناخت وہ بتائی گئی تھی جو تمہارے دائیں پیرے کے تلوے پر ہے۔“

”کیسی نشانی؟“ میں ایک بار پھر چونک پڑا۔

سلویا نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولی۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے دائیں پیرے کے تلوے پر کیا گدا ہوا ہے؟“

میں نے اپنی دائیں ٹانگ اپنے بائیں گھٹنے پر رکھ کر تلوے کی طرف دیکھا۔ وہاں واقعی ایک عجیب سی شے بنی ہوئی تھی۔ سفید جلد پر سیاہ اور سرخ لکیروں سے کسی جانور کی شبیہ کو ابھارا گیا تھا۔ اسے اتفاق ہی کہیں گے کہ یادداشت کھونے کے بعد سے اب تک میری نظر داہنے پیرے کے تلوے پر نہیں پڑی تھی۔

”یہ کیا ہے!“ میں بڑبڑایا۔

”تین سروں والا شیر۔“ سلویا بولی۔ ”اور یہ شاید بچپن ہی میں تمہارے تلوے پر گودا گیا ہوگا۔“  
 ”مگر اس قسم کے نشانات تلووں پر تو نہیں گودے جاتے۔“  
 ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

آخر میں کون ہوں؟ کون ہوں؟ یہ سوال میرے ذہن پر ضربات سی لگانے لگا۔ ہر گزرنے والا دن میری شخصیت کے اسرار بڑھاتا چلا جا رہا تھا مجھے یہ خوف محسوس ہوا کہ یہ بڑھتی ہوئی الجھنیں مجھے پاگل نہ کر دیں!  
 ”کہیں یہ تمہارا خاندانی نشان تو نہیں!“ سلویا بولی ”کاش مجھے یہ سب کچھ یاد آ سکتا!“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔  
 سلویا کچھ سوچنے لگی۔

”اچھا! میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ”اب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میرا جسم بری طرح ٹوٹ رہا ہے۔ کھانا کھانے سے کسلندی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ تم اس دوران میں کھانا کھا آؤ۔ اور ہاں! اگر تم میرا ایک کام کر سکو تو شکر گزار ہوں گا۔ میرے پاس معقول لباس نہیں ہے۔ اگر تم اس کا بندوبست کر سکو تو میں تمہیں کچھ رقم دے دوں۔“  
 ”رقم کی ضرورت نہیں۔ میں بندوبست کر لوں گی۔“

میں اب اتنی زیادہ تھکن محسوس کرنے لگا تھا کہ اس مسئلے پر زیادہ گفتگو کرنا مجھے گراں گزر رہا تھا میں پھر اندرونی کمرے میں چلا گیا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ آنکھیں جیسے خود بخود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ گزشتہ رات سے اب تک مجھے چند منٹ کی نیند بھی میسر نہیں آئی تھی اور گزشتہ سے پیوستہ رات کو بھی زرخن پور جاتے ہوئے ٹرین میں بس اونگھنے ہی کا موقع ملا تھا، نیند اس لیے نہیں آئی تھی کہ ذہن میں اپنی ذات سے متعلق بے شمار سوالات چکرارہے تھے۔

میں لیٹتے ہی سو گیا..... اور جب میری آنکھ کھلی تو سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی سات بجکر دس منٹ اعلان کر رہی تھی میں جلدی سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ قریب ہی سلویا ایک آرام کرسی پر نیم دراز ایک انگریزی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ وہ مجھے اٹھتا دیکھ کر جلدی سے سیدھی ہو گئی اور بولی۔

”میں تمہارے لیے سلاسل یا لباس خرید لائی ہوں ذرا پہن کر دیکھو کہ تمہارے جسمانی ناپ کے بارے میں میرے اندازے درست تھے یا نہیں!“

میں سیدھا غسل خانے میں جا گھسا اور نہا کرتا زہ دم ہو گیا سلویا میرے لیے جو لباس خرید کر لائی تھی وہ میری ناپ کے عین مطابق تو نہیں لیکن کچھ ایسا نامناسب بھی نہیں تھا۔

سلویا نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا اور پھر بولی: ”اس لباس میں تو تم واقعی پرنس معلوم ہونے لگے۔“  
 ”ملاقات ہونے پر بھی تم نے مجھے سب سے پہلے پرنس ہی کہہ کر مخاطب کیا تھا اور اب پھر تمہاری زبان سے یہ لفظ سن کر کیا میں یہ



سوال کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گا کہ تم مجھے پرنس کیوں کہہ رہی ہو؟“

”تمہاری شخصیت کسی ریاست کے پرنس ہی کی طرح باوقار جاذب اور دل نشیں ہے۔“ سلویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پھر میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ ہر میجسٹی اور ان کے عزت مآب شوہر جس شخصیت میں گہری دلچسپی لے رہے ہوں وہ یقیناً کوئی معمولی ہستی نہیں ہو سکتی۔“

”تو یوں سوچ رہی ہو تم؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

لیکن سلویا میری بات کا جواب دینے کی بجائے بولی۔ ”باہر چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”کچھ تفریح کی جائے۔“

”نہیں میرا تفریح کا کوئی موڈ نہیں ہے مجھے ایک کام سے جانا ہے۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ نہیں ہوگی۔“

”تم بھول رہے ہو کہ میرا کام تمہیں تلاش کر کے اپنے ساتھ لندن لے جانا ہے میرے اس کام کا پہلا حصہ مکمل ہو چکا ہے اور دوسرا حصہ باقی ہے پھر ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں!“

”تو کیا تم مجھے زبردستی لندن لے جاؤ گی؟“ میں ہنس پڑا۔

”نہیں۔“ سلویا نے ایک طویل سانس لی۔ ”تمہارے ساتھ کسی قسم کی زبردستی کرنے کے احکامات نہیں ہیں مجھ سے کہا گیا تھا میں تمہیں لندن چلنے پر آمادہ کروں اور اگر مجھے اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکے تو سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگی رہوں۔“

”کیوں پیچھے کیوں لگی رہو؟“

”شریر بچوں کو حفاظت کرنے والے فرشتوں کی ضرورت ہوتی ہے نا!“ سلونا نے شوخی سے کہا اور ہنس پڑی۔

میں نے ہنسی میں اس کا ساتھ نہیں دیا اور سنجیدگی سے بولا۔ ”تم ہوٹل سے باہر تو جا چکی ہو یہ بتاؤ کہ اب تو پولیس ہوٹل میں نہیں ہے۔؟“

”ہال میں سادہ لباس والے دو تین آدمی موجود ہیں۔ ایک کانسٹیبل تمہارے کمرے کے دروازے پر متعین ہے اور مجھے یقین ہے کہ دو چار کانسٹیبلوں کو عقبی زینوں کی نگرانی پر مقرر کیا گیا ہوگا۔ شاید جو گیندر کو یقین ہے کہ تم ابھی تک ہوٹل ہی میں کسی جگہ چھپے ہوئے ہو۔“

”میں دوبارہ اپنے کمرے میں جانا چاہتا ہوں جو گیندر نے وہاں تو کسی کانسٹیبل کو نہیں بٹھا رکھا ہوگا؟“

”شاید نہیں..... مگر تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو!“

”میں اپنے سامان کی تلاشی لوں گا۔ ممکن ہے اس میں سے مجھے کوئی ایسی شے مل جائے جس سے مجھے اپنی شخصیت کا سراغ مل سکے۔“

”تمہارا سامان اب پولیس کی تحویل میں ہے لیکن میں نے اس سے پہلے ہی تمہارے سامان کی تلاشی لے لی تھی مجھے کوئی ایسی چیز

نہیں مل سکی جو تمہیں پر تاب سنگھ کے علاوہ کچھ اور ثابت کر سکے۔“

”ہوں۔“ میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا۔

”لیکن ہوٹل چھوڑنے سے پہلے اگر تم میرے لیے کھانے کا بندوبست کر دو تو.....“

”فی الحال یہ مناسب نہیں ہے کہ تم ہوٹل سے نکلو میں بتا چکی ہوں کہ ہوٹل کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔“

”خیر خیر..... اس مسئلے پر میں کھانے کے دوران میں گفتگو کروں گا۔ تم میرے لیے کھانے کا بندوبست کرو۔“

”اچھا..... لیکن تم اس وقت تک سنگ روم میں نہ آنا جب تک میں آواز نہ دوں۔“

”ٹھیک ہے۔“

سلویا چلی گئی لیکن میرا ارادہ کھانا کھانے کا ہرگز نہیں تھا۔ کھانا تو مجھے بلونت کے ساتھ کھانا تھا جیسے ہی بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی میں لپک کر بالکونی میں پہنچ گیا۔ عقبی گول زینے کا دروازہ توقع کے مطابق اسی طرف سے بند تھا۔ میں نے اسے کھول اور تیزی سے آہنی زینے سے اترتا چلا گیا۔ پھر میں نے آخری زینے پر سے قدم نیچے رکھا ہی تھا کہ ایک کرخت آواز سن کر چونک پڑا۔

”رک جاؤ! کون ہے؟“

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ ان سنتریوں میں سے ایک ہے جن کو سلویا کے بیان کے مطابق جو گیندر نے عقبی زینوں کی نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

میں رک گیا۔

”ادھر ڈیر۔!“ سنتری مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا تھا۔ شاید احتیاطاً! میں اس کی طرف گھوما تو اس نے تارچ کی روشنی میرے چہرے پر پھینکی اور پھر فوراً ہی بجھا بھی دی۔ غالباً وہ مجھے پہچان گیا ہوگا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو بلا لیتا اور مجھے گرفتار کر لیا جاتا۔ میں میں ایک خطرناک صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کوئی ایسی تدبیر سوچنے کی کوشش کرنے لگا جو اس پریشان کن صورتحال سے گلو خلاصی کرا سکتی۔ مجھے اپنی آنکھوں کی اس پراسرار قوت کا خیال آیا جسے میں زرداد بیگ پر آزمایا تھا مگر یہاں ایک دشواری یہ تھی کہ اندھیرا تھا۔ تاریکی میں سنتری کو میری آنکھیں دکھائی نہیں دے سکتی تھیں اس لیے مجھے اس پہلو پر بھی غور کرنا پڑا کہ سنتری میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بغیر مسحور ہو سکے گا یا نہیں؟..... اس سوال پر غور کرتے ہوئے مجھے کیلنڈر کا خیال آیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک بے جان چیز تھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن پھر بھی میری پراسرار قوت نے اسے دیوار سے گرا دیا تھا۔

یہ سارے خیالات تین یا چار سیکنڈ کے اندر اندر میرے ذہن میں چکر لگے تھے اور پانچواں سیکنڈ گزرنے سے پہلے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اپنی اس قوت کا آزمانا ضرور چاہیے خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو۔“



میں نے پوری یکسوئی سے سنتری کی طرف دیکھتے ہوئے اسے انشن ہونے کا حکم دیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ نتیجے کا منتظر تھا۔ اس لمحے میری رگ رگ میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں جب میں نے اندھیرے میں سنتری کی ایڑیاں بچنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ میری اس قوت کا تعلق محض میری آنکھوں سے نہیں بلکہ میرے ذہن سے تھا۔ آنکھیں تو شاید قوت کے استعمال کا بس ایک ذریعہ تھیں۔

میں نے سرگوشی کرنے والے انداز میں کانشیل کو حکم دیا۔ ”تم بالکل بھول جاؤ گے کہ تم نے مجھے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک منٹ تک اسی جگہ کھڑے رہو اور اس کے بعد دوبارہ پہرہ دینا شروع کر دو سمجھ گئے؟“

”ہاں۔“ کانشیل جیسے دور کسی کنویں سے بولا تھا۔

میں بڑی بے فکری اور اعتماد کے ساتھ گھوم کر دوسری طرف چل دیا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز تھیں اور پسینہ جسم سے پھوٹ نکلتا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں نے سخت محنت کا کوئی کام کیا ہو۔ یہی کیفیت اس وقت بھی ہوئی تھی جب میں نے دیوار سے کیلنڈر گرایا تھا۔ غالباً زرداد بیگ پر بھی اس قوت کا استعمال کرتے ہوئے میں تھگ گیا ہوں گا لیکن اس وقت بوڑھے کیپ کی وجہ سے اچانک اتنی گہیر صورت حال پیش آگئی تھی کہ اپنی تھکن کی طرف میرا خیال جا ہی نہ سکا ہوگا۔

سڑک پر پہنچ کر میں نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے ہوائی اڈے کی طرف چلنے کے لیے کہہ کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں جیب سے رومال نکال کر آہستہ آہستہ اپنے چہرے پر پھیرتا جا رہا تھا جیسے پسینہ خشک کر رہا ہوں لیکن میرا مقصد صرف یہ تھا کہ ڈرائیور میرے چہرے کو واضح طور پر نہ دیکھ سکے۔ مجھے اب ایک ایک قدم پر محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ یہاں کا ہر شہری میرے لیے پریشانیاں کھڑی کر سکتا تھا۔

ٹیکسی فرائے بھرتی رہی اور قدرتی طور پر میرا ذہن ان واقعات سے الجھا رہا جو مجھے اب تک پیش آتے رہے تھے۔ حالیہ دو باتیں مجھے اس وقت زیادہ الجھا رہی تھیں۔ سلویا کا بیان میرے لیے حیرت انگیز بھی تھا اور سنسنی خیز بھی! اگر میں یہ مان لیتا کہ فلپ اور الزبتھ میرے دوستوں میں سے تھے تو پھر مجھے یہ بھی یقین کرنا پڑتا کہ میری شخصیت بہت اہم اور معزز ہے۔ تاج برطانیہ کسی معمولی شخص کو تو درخور اعتنا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اب پھر وہی الجھن کہ میں کون ہوں؟

میرے تلوے میں تین سروں والے شیر کی تصویر بھی ایک ایسی ہی چیز تھی جو میری الجھنوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس قسم کے نشان تو ایسی جگہوں پر گدوائے جاتے ہیں جو نظر آتے ہوں۔ تلوے میں اس قسم کا نشان بنانے کا تو ایک مطلب ہی ہو سکتا تھا کہ اسے پوشیدہ رکھا جاسکے۔ مگر کیوں؟ ایسے کسی نشان کو پوشیدہ رکھنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

سلویا کا یہ قیاس بھی میرے ذہن میں گونج رہا تھا کہ شاید یہ میرا خاندانی نشان ہو!

ٹیکسی ہوائی اڈے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اس ریٹورنٹ کا نام بتا دیا جہاں بلونت سے ملنا تھا۔ دو تین ہی

منٹ کے بعد ٹیکسی اس ریسٹورنٹ کے سامنے جارہی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے کرایہ ادا کیا پھر دروازہ کھول کر اتر ا اور ریسٹورنٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت بھی میں رومال اپنے چہرے پر پھیرتا جا رہا تھا۔

بلونت انتظار کرتا ہوا ملا۔ اس نے ایک گوشے کی میز منتخب کی تھی اور یہ میرے حق میں مفید تھا۔ میں ایسی کرسی پر بیٹھا کہ میری پشت بال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف رہے۔ میرے پہنچنے ہی بلونت نے ویٹر کو بلا کر کھانے کا آرڈر دے دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”تم کچھ دیر سے پہنچے ہو۔ میں پریشان ہو گیا تھا۔“

”غیبت ہے کہ میں پہنچ گیا۔ حالات تو مجھے کسی دوسرے رخ پر لیجانا چاہتے تھے۔“

”پولیس؟“ بلونت نے پوچھا اور میرے سر کی اثباتی جنبش دیکھ کر بولا۔ ”مجھے یہ دھڑکا تھا کہ تمہیں پولیس کے خطرے سے دوچار ہونا پڑے گا۔“

”خیر چھوڑو۔ یہ گفتگو بعد میں ہوگی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اس دوران میں کیا کیا؟“

”نیپالی سفارت خانے کے اس افسر کا نام پاتا تھا ہے۔ وہ ایک ایسی کوٹھی میں رہتا ہے جو آبادی سے کچھ الگ تھلگ واقع ہے۔ ارد گرد بڑی پرہول ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک قدیم مندر کے کھنڈرات بھی ہیں اور ان سے کچھ دور ایک مرگھٹ ہے۔ کوٹھی کے تمام ملازمین بھی نیپالی ہیں۔ پاتا کی بیوی مرچکی ہے۔ وہ صرف اپنی بیٹی کے ساتھ وہاں رہتا ہے۔“

”بیٹی۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”اس کی عمر کیا ہوگی؟“

بلونت نے ناگواری کے انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر منہ بنا کر کہا۔ ”جوان ہے..... کیوں؟“

میں نے بلونت کے خیال کو تاڑ لیا تھا اس لیے جھینپ کر بولا۔ ”میرا مطلب وہ ہرگز نہیں تھا جو تم نے سمجھا۔ یہ سوال میں نے محض اس امکان کو پیش نظر رکھ کر کیا تھا کہ شاید ہم اسے ذریعہ بنا کر کلیدیب کور کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔ لڑکیاں بہت کام آتی ہیں۔“

”جیسے کلیدیب کام آئی تھی جیسے سوشیلا کام آئی تھی۔“ بلونت نے زہریلے لہجے میں کہا: ”ان میں سے ایک کی عزت لٹ چکی ہے اور دوسری، اپنی جان نچھاور کر گئی۔“

”خیر خیر! تم آگے بتاؤ!“ میں نے بحث کو ٹالنے کے خیال سے کہا۔ دراصل مجھے ڈرتا تھا کہ اس کا طنز یہ انداز مجھے غصہ بھی دلا سکتا ہے۔

”پاتا کی بیٹی جوان العمر ہے۔ نام ششما ہے۔ کسی مقامی کالج میں پڑھ چکی ہے۔ آجکل ایک کھلاڑی کے چکر میں ہے۔ شاید ٹینس کا قومی چیمپیئن ہے۔ مرزا خورشید نام ہے۔“

ویٹر کھانا لے آیا تھا اس لیے ذرا دیر کے لیے گفتگو روک دینی پڑی۔



ویٹر کے جانے کے بعد بلونت نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”پاتھا کی شخصیت بڑی پراسرار ہے۔ تنہائی پسند شخص ہے۔ دفتر سے لوٹنے کے بعد اپنا سارا وقت گھر ہی میں گزارتا ہے۔ بعض افراد نے اسے کبھی کبھی رات کے وقت مرگھٹ کی طرف جاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ یہ کوئی نہیں بتا سکا کہ وہ وہاں کیا کرنے جاتا ہے۔ سال میں کم سے کم ایک مرتبہ اپنے ملک کا چکر لگانا اس کے معمولات میں شامل ہے۔ دو ایک روز میں وہ کھٹمنڈو روانہ ہونے والا ہے۔“

”خوب!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

بلونت سے معلوم ہونے والی یہ آخری بات یقیناً اہم تھی میں اس کی روشنی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید بوڑھا کیشپ، پاتھا ہی کے ذریعے سے کل دیوبند کو ملک سے اسمگل کرنے کی فکر میں ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس مرتبہ میں پہلی ہی کوشش میں اس منحوس بوڑھے سے ایک قدم آگے نکل گیا ہوں۔ امکان تھا کہ اس مرتبہ میں اپنے دشمن جانی پر سبقت لے جانے میں کامیاب رہوں گا۔ میں نے بلونت سے کہا۔ ”میں پاتھا کی کوئی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہم ابھی وہاں چلے چلیں گے لیکن اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔“

ہمیں پاتھا کی قربت حاصل کرنا چاہیے۔ شاید اس طرح ہم اپنے ہاتھوں کو بوڑھے کیشپ کی گردن تک پہنچا سکیں۔“

کھانا کھا چکنے کے بعد ہم ریسٹورنٹ سے نکلے اور بلونت نے وہاں کھڑی ہوئی کاروں میں سے ایک کا دروازہ کھولا۔

”کیا مطلب!“ میرے لہجے میں استعجاب تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

”چلو بیٹھو!“ بلونت نے کہا۔

”لیکن یہ گاڑی تمہارے پاس کہاں سے آگئی۔“

”یہ مت بھولو کہ میں زرنجن پور کے مہاراج کا دست راست ہوں۔ ان کی ایک محل نما کوٹھی یہاں بھی ہے اور کئی کاریں اس کوٹھی کے گیراج میں کھڑی رہتی ہیں۔ انہی میں سے ایک کار میں لے آیا ہوں۔“ بلونت نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کھولتے ہوئے کہا۔

میں دوسری طرف کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھ گیا۔ بلونت بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس نے انجن اشارت کیا اور کار چکنی سڑک پر پھسلنے لگی۔

”اگر ہمیں اپنی مدد کے لیے کسی وقت کچھ آدمیوں کی ضرورت پڑے تو اس کا انتظام بھی آسانی سے ہو جائے گا۔“ بلونت نے کہا۔

”یہ بڑا اچھا ہے۔ شاید ہمیں ضرورت پڑ ہی جائے۔“

”اب یہ بتاؤ کہ تم دن بھر کیا کرتے رہے۔ تمہیں کن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔؟“

بلونت پر اب مکمل اعتماد کیا جاسکتا تھا اس لیے میں نے وہ سب کچھ بلا کم و کاست بیان کر دیا جو مجھ پر گزر چکا تھا لیکن میں نے اپنے

ذہن کی اس پراسرار قوت کا ذکر گول کر دیا جس نے دو مرتبہ میری مدد کی تھی۔

میری کہانی سن کر بلونت کی آنکھوں سے بھی الجھن جھانکنے لگی۔ جب اس نے ان واقعات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو میں نے اسے ٹوکا۔

”کیا سوچنے لگے۔؟“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم آخر ہو کیا بلا؟“

”یہی الجھن تو مجھے بھی گھیرے ہوئے ہے میرے دوست!“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

بلونت کچھ نہیں بولا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

کچھ دیر بعد کارشہری حدود سے نکل کر ایک نسبتاً ویران علاقے میں پہنچ گئی۔ ایک جگہ بلونت نے کار روک دی اور انجن بند کرتا ہوا بولا۔ ”یہاں سے وہ کچھ ہی دور ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہم وہاں تک پیدل جائیں۔ ہماری کار کو کوٹھی کے قریب دیکھ کر پاتھا یا اس کا کوئی ملازم مشکوک ہو سکتا ہے۔“

میں نے بلونت کی رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں پیدل چل پڑے۔

نیپالی سفارت خانے کے اس افسر کی کوٹھی واقعی ایک وحشت ناک سے مقام پر تھی۔ رات کے اندھیرے میں وہ ماحول کچھ اور زیادہ پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ کوٹھی کے گرد چہار دیواری نہیں تھی لیکن کوٹھی کے سامنے والے حصے میں بے ترتیب گھاس کے تختے پھیلے ہوئے تھے۔ کیاریوں کے لیے جگہ تو چھوڑی گئی تھی مگر فی الحال وہاں پھول پودوں کی بجائے جھاڑ جھنکار نظر آ رہا تھا اس چھوٹے سے جنگل میں حشرات الارض کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ اور کہیں دور سے کسی گیدڑ کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”آخر یہ شخص اس بھیانک ماحول میں کیسے رہ لیتا ہے بلونت!“ میں بولا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ پاتھا کی شخصیت بڑی پراسرار ہے۔“ بلونت نے جواب دیا۔

ہم کوٹھی کے سامنے ایک جھاڑی میں کھڑے ہوئے تھے۔ دو ایک کھڑکیوں کے علاوہ ہمیں ساری عمارت میں اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔

کسی انجن کی آواز سن کر ہم دونوں کے سر آواز کی سمت گھوم گئے۔ کچھ دور سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ روشنیاں اس کچے راستے پر مڑ گئیں جس پر چل کر اس کوٹھی تک آیا جاسکتا تھا۔

”اوہو! یہ تو ٹرک معلوم ہوتا ہے۔“ بلونت بیساختہ بولا۔ اور پھر خود بھی اس کے قریب ہی گر گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو بلونت میری اس حرکت پر بری طرح جھلا گیا ہوگا لیکن دوسرے ہی لمحے شاید اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اگر میں نے یہ حرکت نہ کی ہوتی تو ہم دونوں ٹرک کہ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نہا جاتے۔





”پاتھا۔“ بلونت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”وہ پاتھا ہے، نیپالی سفارت خانے کا وہی افسر۔“

”کیٹپ کے ساتھ اس کا انداز مودبانہ ہے۔“ میں بڑبڑایا۔ ”نہ جانے یہ بوڑھا کیا چیز ہے!“

بلونت کچھ نہیں بولا۔ اس کی نظریں پاتھا پر جمی ہوئی تھیں جو کہ بوڑھے کیٹپ کے لیے ٹرک کا دروازہ کھول رہا تھا۔ بوڑھا فوراً ٹرک میں سوار ہو گیا۔ پاتھا سر جھکائے تعظیماً کھڑا رہا تھا ٹرک نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جب وہ کچھ دور نکل گیا تو پاتھا مڑ کر کوٹھی کی طرف چل دیا۔ ایک ملازم نے گیٹ بند کیا اور پھر وہ بھی پاتھا کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

”آؤ! میں نے بلونت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”میں کسی بھی طرح سے اس تابوت پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں!“ بلونت جیسے بے خیالی میں بولا تھا۔

”اگر کوٹھی میں کوئی موت ہوئی ہوتی تو تابوت کا انتظام خود پاتھا نے کیا ہوتا۔ بس ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تابوت میں کیٹپ کوئی ایسی چیز چھپا کر لایا ہوگا جسے پاتھا کے ذریعے ملک سے باہر بھیجنا مقصود ہوگا۔ سفارتی نمائندوں کے سامان کی تلاشی نہیں لی جاتی۔“

چند لمحوں تک بلونت خاموش رہا۔ وہ شاید میری بات پر غور کر رہا ہوگا۔ آخر جب وہ بولا تو اس کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی

”تمہارا مطلب..... یہ تو نہیں..... کہ..... تابوت میں..... کلدیہ.....“

”یہ ایک قیاس ہے جو غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ بات طے ہے کہ اگر وہ کلدیہ ہوتی تو زندہ ہی ہوگی۔ کیٹپ کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایک لاش کو لیے لیے پھرے۔“

”مگر وہ کلدیہ کو زندہ حالت میں بھی کیوں لیے لیے پھر رہا ہے!“ بلونت کے لہجے سے الجھن مترشح تھی۔

”اس سلسلے میں بس قیاس ہی کیا جاسکتا ہے کہ وہ کلدیہ کو کسی طرح میرے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔“

”آخر تم کیا بلا ہو؟“ بلونت کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ ”کاش یہ اسرار بے پردہ ہو جائیں۔“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کا کندھا تھپک کر قدم آگے بڑھاتا ہوا بولا۔ ”آؤ۔“

”کیا تم کوٹھی میں گھسنا چاہتے ہو؟“

”کوٹھی میں گھسے بغیر اس تابوت کو دیکھنا کیسے ممکن ہے!“

بلونت نے کچھ نہیں کہا اور میں کوٹھی کے احاطے کا جائزہ لینے لگا اس کی دیوار عام احاطوں کی دیوار سے کہیں زیادہ اونچی بنی ہوئی تھی لیکن اس پر چڑھنا کچھ ایسا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ اس میں جگہ جگہ کٹاؤ سے بنے ہوئے تھے جو شاید خوشنمائی کے لیے رکھے گئے تھے۔

ارد گرد کے ماحول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف حشرات الارض کی سیٹیاں سی گونج رہی تھیں۔ کبھی کبھی مرگھٹ کی طرف سے اٹھنے



والی سیاروں کی چٹیں بھی سناٹے کا جگر چیر دیتیں۔

”رہائش کے لیے..... یہ کتنی غلط جگہ ہے۔ بھیا نک، خوفناک اور اعصاب شکن۔“ بلونت بڑبڑایا۔

”کچھ لوگوں کو ایسا ماحول بھیا نک نہیں، پرسکون لگتا ہے۔“ میں نے جوابا کہا۔

ہم گھوم کر کوٹھی کی پشت پر پہنچے۔ یہاں سناٹے کی چادر کچھ اور دبیز تھی۔ مکمل تاریکی کا راج تھا۔ تاروں کی چھوٹ میں ارد گرد کے سائے عجیب عجیب شکلیں اختیار کیے ہوئے تھے۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے ایک سایہ چند لمحوں کے لیے تاریکی سے جدا ہو کر تاریکی میں فنا ہو گیا ہو۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے کوئی تاریک وجود خاموشی سے ہمارے تعاقب میں ہو۔ شاید کچھ ایسی ہی بات بلونت نے بھی محسوس کی تھی وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس دیرانے میں بھوتوں کا راج ہو اور جیسے مرگھٹ کی بری روہیں ہمارے پیچھے لگ گئی ہوں۔“

میں دھیمی سی آواز میں ہنس پڑا پھر بولا۔ ”یہ ماحول تو واقعی اعصاب شکن ہے مگر بلونت! مجھے تم سے ایسی لغو باتوں کی توقع نہیں تھی۔ بھوت، بری روہیں، کیا بکواس ہے؟“

بلونت نے اس موضوع پر کوئی بحث نہیں چھیڑی لیکن ایک دو مرتبہ اس سمت میں ضرور دیکھا جدر مرگھٹ تھا۔

”احاطہ پھلانگنے کے لیے یہ جگہ مناسب رہے گی۔“ میں ایک جگہ رک کر بولا مگر بلونت میری باتوں کا جواب دینے کی بجائے دہنی طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں گھورتا رہا پھر اس نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا اور لرزیدہ آواز میں بولا۔ ”اس طرف..... مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی عورت تھی۔“

”اس دیرانے میں؟..... بلونت ڈیر! خود کو سنبھالو ہمارے سوا یہاں کوئی ذی روح نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

بلونت کو شاید مجھ سے اتفاق نہیں تھا مگر پھر اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ میں آستین چڑھا کر دیوار کے قریب پہنچ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ایک کٹاؤ پر پیر رکھ دیتا پشت پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ بلونت اچھل پڑا تھا۔

”ٹھہر جاؤ!“ ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی اور میں ہکا بکا رہ گیا۔ تاریکی سے جدا ہو کر تاریکی میں گم ہو جانے والا وجود اب ہمارے قریب پہنچ گیا تھا۔

”سلویا!“ میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

”آپ کی خادم۔“ دیرانے میں سلویا کی چہکار گوئی۔

”مگر تم یہاں کیسے؟“

اپنا فرض پورا کر رہی ہوں۔“ سلویا نے ٹھنڈی سانس بھر کہا۔ ”میں نے بتایا تھا نا کہ اگر تم میرے ساتھ نہیں گئے تو میں سائے کی

طرح تمہارے پیچھے لگی رہوں گی اور یہ تو تم بھی جانتے ہو گے کہ سائے کو اپنے وجود سے جھٹک دینا ایک ناممکن بات ہے۔“



بلونت حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اس کی حیرت رفع کرنے کے خیال سے میں نے کہا۔ ”بلونت! یہ مس سلویا ہیں۔ مرگھٹ کی کوئی بدروح نہیں، میری ایک دوست ہیں..... اور سلویا! یہ مسٹر بلونت ہیں۔ زرنجن پور کے راجا شمشیر سنگھ کے دست راست۔“

بلونت ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بددعا کر رہ گیا۔

”تو آپ لوگ راج کمار کی تلاش میں یہاں آئے ہیں؟“ سلویا بولی۔ ”مگر وہ بوڑھا کون تھا جو تابوت لے کر آیا تھا؟“

”میرا دشمن جانی کیشپ.....“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ”وہی منحوس کلدیہ کو لے اڑا ہے۔“

”تو کیا تمہارے خیال میں وہ بوڑھا راج کمار کی تابوت میں ڈالے ہوئے گھوم رہا ہوگا۔!“

”یہ ناممکن تو نہیں۔“ میں نے کہا، پھر بولا۔ ”تم یہاں کیسے پہنچیں؟“

”تمہارا تعاقب کر کے۔“ سلویا نے جواب دیا۔ ”تم نے سمجھا تھا کہ کھانا لانے کا کام سوئپ کرتی مجھ سے چھکارا پا لو گے میں اتنی آسانی سے دھوکا نہیں کھا سکتی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ تم بھاگ نکلنے کی فکر میں ہو لہذا میں ہوٹل سے نکل کر اس کی پشت پر پہنچ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں تمہیں سنتریوں سے الجھا ہوا پاؤں گی۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ تم ایک سنتری کے قریب سے گزر رہے تھے اور وہ یوں کھڑا ہوا تھا جیسے اس نے تمہیں دیکھا ہی نہیں ہو۔ کیا کوئی بھاری رقم تمہادی تھی تم نے اس کے ہاتھ میں۔“

میں دھیمی آواز میں ہنسا مگر کچھ بولا نہیں۔

”بہر حال میں تب ہی سے تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہوں۔“ سلویا نے کہا۔ ”اور اگر میں اس وقت تمہیں دیوار پر چڑھنے سے روک نہ لیتی تم یا تو اب تک مر چکے ہوتے یا کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے جس سے چھکارا حاصل کرنا شاید آسان نہ ہوتا۔“

”بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

”ادھر دیکھو! سلویا نے کہتے ہوئے سینسل نارچ روشن کر لی روشنی کی شعاع دیوار پر اس جگہ پر پڑی جہاں پر میں پاؤں رکھنے والا تھا۔“ اینٹوں پر لپٹا ہوا یہ ننگا تار دیکھ رہے ہو، سلویا بولی۔ ”اس پر پاؤں رکھ کر تم یا تو بجلی کا زبردست اور شاید جان لیوا جھٹکا کھاتے اور یا پھر اس تار کے دبے سے کوٹھی کے اندر کسی حصے میں گھنٹی بج اٹھتی اور وہ لوگ جان لیتے کہ کوئی شخص ناجائز طور پر کوٹھی میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ جب تم لوگ اندر داخل ہوتے تو چوہوں کی طرح پکڑ لیے جاتے۔“

میں سنائے کے عالم میں کھڑا کھڑا رہ گیا۔ میں واقعی ایک خطرے سے بال بال بچا تھا۔ چند لمحے سکوت رہا اور پھر یہ خاموشی بلونت نے توڑی اس نے شک و شبہ سے لبریز آواز میں کہا۔ ”اس اندھیرے میں آپ کو یہ باریک تار کیسے نظر آ گئے مس سلویا۔؟“

”محض اتفاقاً۔“ سلویا نے جواب دیا۔ ”آپ لوگ کوٹھی کے سامنے جھاڑیوں میں چھپے تھے لیکن میں نے احاطے کی دیوار کو آڑ بنایا تھا۔ ٹرک کی آمد پر میں دیوار سے چپک گئی تھی اور اسی وقت میرا ہاتھ اس قسم کے ایک تار پر پڑا تھا میں چونک کر دیوار سے الگ ہٹ گئی تھی۔ پھر میں نے نارچ جلا کر اس کی روشنی دیوار پر ڈالی تھی تو مجھے تار دکھائی دیا۔“



”مگر تمہیں یہ تار چھونے کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا اور نہ کوٹھی کے کینوں کو تمہاری موجودگی کی اطلاع ہوئی۔“ میں حیرت سے بولا۔  
کوٹھی کے کینوں کو اس وقت ٹرک اور اس بوڑھے کا انتظار تھا۔ غالباً کسی کھڑکی سے دیکھنے کے بعد ہی کنکشن آف کیا گیا ہوگا لیکن  
ٹرک کے واپس جانے کے بعد گیٹ بند کر کے ان تاروں کو ایکٹیویٹ کر دیا گیا ہوگا۔“

”یہ کوٹھی..... اور اس کے کین..... ہر لمحے پر اسرار ہوتے جا رہے ہیں۔“ میں بڑبڑایا۔

”نیپالی بھی پر اسرار لگتے ہیں۔“ سلویا نے کہا۔

”مگر اب کیا کیا جائے؟“ بلونت بولا۔ ”کوٹھی میں داخلہ تو ممکن نظر نہیں آتا۔“

”یہ مہم کل پر بھی ٹالی جاسکتی ہے۔“ سلویا نے اظہار خیال کیا۔

”جو مشکل آج درپیش ہے وہی کل بھی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔“ سلویا نے کہا۔ ”میں نے آج کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی تھی کہ کل یہاں ایک پارٹی ہونے والی ہے جس

میں شہر کے معززین مدعو ہوں گے۔ میں اس پارٹی میں شرکت کے دعوت نامے حاصل کر لوں گی۔“

اس وقت میرے ذہن میں ایک اور ہی خیال ابھرا میں سوچ رہا تھا کہ اگر پاتھا کی لڑکی واقعی خوبصورت اور نو جوان ہے تو اس کو  
آلہ کار بنالینا میرے لیے کچھ مشکل ثابت نہ ہوگا۔ مجھے اپنی مردانہ وجاہت پر گھمنڈ سا ہوتا جا رہا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ میں اپنے اس  
ہتھیار کو ہر لڑکی پر آزماسکتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے ذہن کی اس پر اسرار طاقت پر بھی اعتماد ہوتا جا رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ میں اس  
طاقت کو ہر شخص پر آزماسکتا ہوں۔

سلویا کی تجویز کے مطابق ہم وہاں سے لوٹ آئے۔ مجھے سلویا اپنے ساتھ کھینچ لائی۔ وہ ایک چھوٹی سی کار میں تھی۔ بلونت اپنی کار  
میں اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

رات گزرنے کے لیے ہم نے اپنے ہوٹل کا رخ نہیں کیا بس وہاں سے گزرتے ہوئے چند منٹ کے لیے رکے تھے۔ سلویا اوپر  
اپنے کمرے میں گئی تھی اور کچھ ضروری سامان لے کر لوٹ آئی تھی۔ پھر ہم نے ایک اور فرسٹ کلاس ہوٹل کا رخ کیا تھا۔ وہاں تین کمرے  
لے لیے گئے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ریسپشن پر صرف بلونت اور سلویا گئے تھے۔ میں پام کے ایک بڑے گیلے کی آڑ میں کھڑا  
رہا تھا کہ کہیں کسی کی نظروں میں نہ چڑھ جاؤں۔ پہچان لیے جانے کا دھڑکا تو بدستور لگا ہوا تھا۔

تین کمرے لیے جانے پر مجھے حیرت ہوئی مگر حیرت اس وقت رفع ہو گئی جب غسل خانے کا دروازہ کھول کر سلویا میرے کمرے  
میں آدھکی۔ اس نے ایسے کمرے چنے تھے جن میں دو کے درمیان ایک ہی باتھ روم تھا۔ میں سمجھ گیا کہ سلویا نے محض بلونت کے خیال سے  
میرے اور اپنے لیے الگ الگ کمرے لیے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی مطلب باری کا راستہ بھی ڈھونڈ ہی لیا تھا۔

میرے ذہن میں متعدد الجھنوں کے تار پھیلے ہوئے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تفکرات کی کڑی نے میرے پورے

دماغ پر جالاتان دیا ہو۔ میرا ذہن اس جال میں کسی بے بس کبھی کی طرح پھنسا ہوا تھا اے کاش! کوئی صورت اس جال سے نکلنے کی ہوتی!..... کتنے ہی سوال تھے جو ہنوز تشنہ تھے اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ان کی تشنگی رسوا ہوتی جا رہی تھی۔ میں 'یعنی' 'اپالو' آخر کون ہوں؟ بنیادی اہمیت اسی سوال کی تھی۔ اگر اس سوال کا جواب مل جاتا تو شاید باقی سوال بے معنی ہی ہو کر رہ جاتے۔ میرے لیے بنیادی اہمیت خود آگاہی کی تھی اور خود آگاہی کی منزل کے دھندلے دھندلے نشانات مجھے اپنے ارد گرد کئی سمتوں میں نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نشان سلویا تھی۔ اگر میں اس کے ساتھ لندن چلا جاتا تو مجھے وہ منزل گم گشت مل جاتی لیکن حالات کی تیز و تند آندھی مجھے اس سمت میں جانے سے روک رہی تھی۔ مجبوراً مجھے اس نشان کی طرف دوڑنا پڑا جس کا نام راج کمار کی کلدیہ کور تھا۔ اگر میں راج کمار کی تک پہنچ جاتا تو بھی میری گمشدہ شخصیت مجھے واپس مل سکتی تھی لیکن کیڈپ!..... بوڑھا کیڈپ میرے راستے کی دیوار بننا ہوا تھا۔ غالباً اسی کی یہی خواہش تھی کہ میرے ذہن کے ظلمات میں کھوئی ہوئی شخصیت روشنی کی، ہلکی سی کرن بھی نہ پاسکے۔ اس سے پہلے کہ میں خود کو ڈھونڈ لوں، وہ مجھے ہلاک کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ پر متعدد حملے کروائے تھے اور ایک دفعہ بذات خود بھی میدان عمل میں اتر آیا تھا لیکن میرے ستارے اچھے تھے کہ میں خارزار اجل میں گر کر لبو لبہاں ہونے سے بال بال بچ گیا۔ زندگی کسی ماں کی طرح مجھ پر مہربان رہی تھی لیکن الجھن کا یہ گرداب میرے لیے کتنا شدید تھا کہ وہ منحوس بڑھا مجھے کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے۔؟ آخر میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ اسے مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ آخر میں کون تھا۔؟ میری شخصیت اتنی اہم تھی کہ تاج برطانیہ بھی مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ برطانوی انٹیلی جنس کی تیز و طرار لڑکی سلویا محض اس لیے ہندوستان بھیجی گئی تھی کہ وہ کسی طرح مجھے تلاش کرے اور اپنے ساتھ لندن لے جائے۔ آخر میں برطانیہ عظمیٰ کی دلچسپی کا مرکز کیوں بن گیا تھا؟ میری حیثیت کیا تھی؟ میرے ایک چہرے کے تلوے پر بنا ہوا تین سروں والے شیر کا نشان کیا معنی رکھتا تھا۔؟

”الجھن..... شدید الجھن!

تفکرات کی مکڑی کا جال!

## سلطان اور خان

سلطان اور خان اسلام کی بالادستی قائم کرنے والے حکمران سلطان اور خان کی باطل کے خلاف جنگ کی تاریخی داستان ہے۔ سلطان اور خان عثمانی ترکوں کے پہلے سلطان عثمان کا بیٹا تھا۔ عثمان بستر مرگ پر تھا اور اسکی خواہش تھی کہ وہ یونانیوں کے شہر بروصہ کو فتح کرے اور مرنے کے بعد اسکو بروصہ شہر میں دفن کیا جائے۔ سلطان اور خان نے یونانیوں کو عبرت ناک شکست دے کر اپنے باپ کی آخری خواہش کو پورا کیا۔ یہ ناول کتاب گہر پر دستیاب۔ جسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔



اور میرا ذہن اس جال میں بے بسی سے تلملارہا تھا۔ کاش اس وقت مجھے معلوم ہو سکتا کہ یہ بے بسی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ مستقبل قریب میں تو مجھے اس سے بھی زیادہ مایوس کن صورت حال سے دوچار ہونا تھا۔ تباہی و بربادی اپالو کے جلو میں چل رہی تھی۔ حالات بہت جلد ایک عجیب و غریب رُخ اختیار کرنے والے تھے۔ ایک ایسا رُخ کہ زندگی پر موت کا گمان ہونے لگے۔

دوسری صبح جب میں اٹھا تو سلویا بستر پر موجود نہیں تھی۔ وہ باتھ روم کے راستے اپنے کمرے میں چلی گئی ہوگی۔ جب میں نہادھو کر تیار ہوا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی سلویا کی آواز سنائی دی۔

”دروازہ کھولو پرنس! کیا تم جاگ گئے؟“

میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر اس کا بولٹ گرایا۔ فوراً ہی باہر سے دروازے پر دباؤ پڑا اور سلویا اندر گھسیتی چلی آئی اس کے پیچھے بلونت بھی تھا سلویا اسے اس کے کمرے سے لیتی ہوئی آئی تھی۔

”مناسب ہوگا کہ ہم تینوں یہیں کمرے میں ناشتہ کر لیں۔ اگر ڈائننگ ہال کا رُخ کیا تو اس بات کا احتمال ہے کہ کوئی تمہیں پہچان لے۔“

میں نے دروازہ بند کیا اور جب مڑا تو دیکھا کہ سلویا ٹیلیفون پر ناشتے کے لیے ہدایات دے رہی تھی۔ بلونت کرسی پر بیٹھا کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا ظاہر ہے کہ میری طرح اسے بھی راج کماری کی فکر کھائے جارہی تھی۔ وہ کل دیب کور سے اتنی ہی محبت کرتا تھا کہ اس سے میرا جائز تعلق ثابت ہو جانے کے باوجود بھی اس کے جذبے ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے۔ گو کہ اس کے حالات نے میرے دوش بدوش چلنے پر مجبور کر دیا تھا اور دیکھنے والے ہمیں ساتھی ہی سمجھتے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ راج کماری کی دست یابی کے بعد وہ طوطے کی طرح مجھ سے آنکھیں پھیر لے گا۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھ پر کوئی وار لگانے کی کوشش کرتا۔ اسے بلاشبہ مجھ سے نفرت تھی۔ حالات سے مفاہمت کے طور پر اس نے اس نفرت کو اپنے سینے کی گہرائی میں پنچا دیا تھا لیکن راج کماری کی بازیابی کے بعد وہ نفرت کسی زہریلے چشمے کی طرح ابل پڑتی۔

جب ویٹر ناشتہ لے کر آیا تو میں کرسی سے اٹھ کر کچھ دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ مناسب یہی تھا کہ میں ویٹر کی نظروں میں بھی نہ آؤں۔ ویٹر کے چلے جانے کے بعد میں پھر سلویا اور بلونت کے ساتھ بیٹھا ناشتے کے دوران میں سلویا بولی۔

”میں ناشتہ کر کے چلی جاؤں گی اور اسی وقت واپس لوٹوں گی جب پاتھا کی کوٹھی میں ہونے والی پارٹی کے دعوت نامے حاصل کر لوں گی۔“

”اگر میں تم سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہاں سے بھاگ گیا تو؟ میں نے مسکرا کر کہا۔

”بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟ یہ تو میں جان ہی چکی ہوں کہ تم پاتھا کی کوٹھی کا رُخ کرو گے۔ ویسے اب مجھے تم سے اس حماقت کی توقع نہیں ہے۔ تمہیں یہ احساس تو ہوگا کہ میرے ہی تعاون سے تم پاتھا کی کوٹھی میں داخل ہو سکتے ہو۔“

”اس غلط فہمی میں نہ رہنا۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اگر تم دعوت نامے حاصل کر لیتی ہو تو بے شک پاتھا کی کوٹھی میں داخلہ

آسان ہو جائے گا لیکن اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو بھی کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اگر تم میری صلاحیتوں کو آزمانا چاہو تو آزمالو۔“

”میں اس نکتے پر کسی بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھوں گی۔“ سلویا مسکرا بولی۔ ”میں یہ مان لیتی ہوں کہ تم یہ دعویٰ کرنے کے اہل ہو۔“

”لیکن اس پارٹی میں شرکت تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“ بلونت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہاں مجھے پہچانا جاسکتا ہے۔؟“

”ہاں۔“

”میں اس کا حل سوچ چکی ہوں۔“ سلویا بول پڑی۔

میں اور بلونت سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”میک آپ۔“ سلویا قدرے توقف سے بولی۔ ”میں تمہارے چہرے کو اتنا تبدیل کر دوں گی کہ تم بھی خود کو نہیں پہچان سکو گے۔“

”میں اس کے لیے تیار نہیں۔“ میں نے برجستہ کہا۔

”کیوں؟“ سلویا کی حیرت بھی بجاتھی۔

”مجھے میک آپ کے خیال ہی سے کراہیت ہوتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی جس کا اظہار میرے لیے ممکن نہیں تھا اگر میں اس بات کو زبان پر لاتا تو شاید جھینپ جاتا۔ آخر میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ میں ایک حسین ترین شخص ہوں اور اپنی اسی وجاہت سے ششما کو میں اپنے جال میں پھنساؤں گا تاکہ اس سے معلوم ہو جائے کہ تابوت کوٹھی کے کس حصے میں رکھا ہے۔؟

ویسے اس کے علاوہ بھی میک آپ سے میرے احتراز کا ایک سبب تھا۔ وہ سبب اس وقت تو میرے لاشعور کی تہوں میں چھپا ہوا تھا لیکن کافی عرصہ گزرنے کے بعد مجھ پر یہ بات آشکارا ہوئی تھی کہ میں خود اپنے آپ سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں زرگسیت کا شکار ہو چکا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بے شمار خوبصورت زندگیاں میری زندگی میں آئیں لیکن وہ مجھے بس اسی حد تک متاثر کر سکیں کہ میں ان کے جلتے ہوئے بدن اور سلگتے ہوئے لب و رخسار سے کھیلنے کے لیے مضطرب ہو جاؤں ہمیشہ یہی ہوا کہ ان سے آسودگی پانے کے بعد میں نے انہیں اپنے شبستان سے دور پھینک دیا۔ مجھے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں ہو سکی کیونکہ میں زرگسیت کا شکار ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔

میری سرگزشت پڑھنے والوں میں بعض ایسے بھی ہوں گے جن کے لیے ”زرگسیت“ کی اصطلاح اجنبی ہوگی اور بعض ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے یہ اصطلاح اکثر پڑھی ہوگی مگر انہیں اس کے پس منظر کا علم نہ ہوگا۔ اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر وہ چھوٹی سی دلچسپ کہانی قلمبند کر دوں۔

سینکڑوں ہزاروں سال قبل سرزمین اسرار یونان میں ایک بچہ پھولوں کا سارنگ رس لے کر پیدا ہوا۔ کاہن اعظم نے اس کا



زانچہ نکالا اور پھر بڑے پراسرار لہجے میں اس کی ماں سے بولا۔ ”تیرا بچہ بہت بڑی عمر پائے لیکن شرط یہ ہے کہ اسے اپنی ذات کا علم نہ ہو۔“

بچہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا رہا اور جب اس نے جوانی کی مخمور و شاداب وادی میں قدم رکھا تو اس کی نظروں میں اپنی ذات کے سوا کوئی اور شے چمکتی ہی نہ تھی۔ یہ اس سبب وہ الگ تھلگ رہا کرتا۔ سنسان وادیاں اس کا گوشہ سکون تھیں۔ ان ہی وادیوں میں ایک روز اسے ایک پری نے دیکھ لیا اور ہزار ہزار جان سے اس پر فر لقیہ ہو گئی لیکن اس کو اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ پری کی رعنائی اور ملتجیانہ نگاہوں سے بے نیاز، پھولوں کو روندنا کچلتا ہوا اپنے خیالوں میں مست، وہاں سے گزر جاتا۔ پری نے اس کی بے نیازی کو اپنی توہین جانا اور تلملا گئی۔ اس نے انتقام لینے کے لیے خداوند زیوس سے دعا کی۔ باب قبول وا ہوا اور اس سے اگلے روز جب وہ اپنی ذات میں گم، اپنے خیالات میں مست اور اپنے حسن پر نازاں اس وادی سے گزرا تو اچانک اس کی نظریں پھولوں سے ڈھکے ہوئے ایک تالاب پر پڑیں۔ پانی میں اسے اپنا عکس نظر آیا تو وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ پہلے کبھی اس نے اپنا عکس نہیں دیکھا تھا۔ اب جو دیکھا تو دیکھتا رہا گیا، اس کے دل میں خواہش پارے کی طرح مچل اٹھی کہ اس عکس کو اپنی بانہوں میں لے لے۔ وہ بے محابہ کنارے پر لیٹ گیا۔ عکس کو اپنی آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کی مگر جب بھی اس کے ہاتھ پانی کی سطح سے ٹکراتے، عکس منتشر ہو جاتا وہ اپنے ہاتھ پانی سے الگ کر لیتا اور پر شوق نظروں سے سطح کی طرف دیکھتا رہتا۔ پری نے جو اس کا یہ عالم وارفتگی دیکھا تو بہت گھبرائی۔ اس نے اسے پکارا، جھنجھوڑا مگر بے سود!..... وہ بار بار اپنے عکس سے یہ سوال کرتا جاتا۔ ”آخر تم کون ہو؟ تم اس قدر حسین کیوں ہو!“ وہ اپنے عکس کو دیکھ کر والہانہ انداز میں مسکراتا بھی جاتا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

## میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے ”حال“ سے غیر مطمئن ہونے اور ”شکر“ کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے **رومانی معاشرتی ناول** سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔



گھڑیاں گزر گئیں۔ دن بیت گئے لیکن وہ وہیں لیٹا اپنے محبوب عکس کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور دل کی دھڑکن رک گئی۔ روح جسد خاکی سے پرواز کر گئی۔ دیوتاؤں کو اس کی حالت پر حرم آگیا اور انہوں نے اسے نرگس کا پھول بنا دیا۔

اسی داستان کو پیش نظر رکھ کر ماہرین نفسیات نے ”نرگسیت“ کی اصطلاح وضع کی ہے جن لوگوں میں خود بینی، خود پرستی اور خود پسندی کا عنصر شدت سے پایا جاتا ہے انہیں نرگسیت کا شکار کہا جاتا ہے۔

یہی کیفیت میری بھی تھی، مجھے اپنے چہرے سے انس ہے، پیار ہے، عشق ہے۔ میں یہ بات گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے محبوب چہرے پر کوئی مکروہ خول چڑھا دیا جائے۔

لیکن اس وقت سلویا نے اس معاملے میں مجھ سے کوئی بحث نہیں کی۔ وہ جلدی میں تھی اس نے ناشتہ ختم کر کے کہا۔

”میں واپس آ کر اس سلسلے میں گفتگو کروں گی۔“

پھر وہ چلی گئی۔ بلونت خاموش بیٹھا کسی سوچ میں ڈوبا رہا میں سگریٹ جلا کر اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ مجھے خود بھی احساس تھا کہ میں اپنی اصلی شکل و صورت میں اس پارٹی میں شریک ہوا تو خطرات سے دوچار ہو سکتا ہوں لوگ مجھے پہچان سکتے تھے اور لوگوں سے زیادہ کیشپ کی طرف سے خطرہ تھا۔ لیکن یہ خطرات مول لیے بغیر بات بھی تو نہیں بن سکتی تھی۔ اس تابوت کا سراغ آخر کیسے لگتا؟ نہ جانے وہ کوئی کس کس حصے میں ہو؟..... اس کا ہالگانے کے لیے کسی کو آلہ کار بنانا ضروری تھا اور ششما میرا آلہ کار بن سکتی تھی۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر اچانک بلونت کھڑا ہو گیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

”میں آدھے گھنٹے میں واپس آؤں گا۔“ وہ بولا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”کسی قریبی تارگھر سے مہاراج کو آج تک کی رپورٹ کرونگا۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ میں انہیں صورت حال سے ہمہ وقت آگاہ رکھوں۔“

بلونت چلا گیا تو میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بستر پر جا لیٹا۔ ذہن بدستور مڑی کے جال کی گرفت میں تھا۔ حالات نے مجھ پر بڑی مضبوط گرفت قائم کر رکھی تھی جب کہ میں چاہتا تھا کہ حالات کو اپنی گرفت میں لوں۔ مجھے امید تھی کہ جلد یا بدیر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن فی الحال وقت مجھ پر سوتیلی ماں کی طرح نامہربان تھا۔

بلونت آدھے گھنٹے کی بجائے ڈیڑھ گھنٹے میں واپس لوٹا لیکن میں نے اس سلسلے میں اس سے کسی استفسار کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ بلونت بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہوا وہ اپنی ہی کسی سوچ میں غرق تھا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آیا تو سلویا بھی آگئی۔ وہ کامران لوٹی تھی۔ اس نے دعوت نامے میرے سامنے پیش دیے لیکن اس کی یہ کامیابی میرے لیے کوئی حیرت انگیز امر نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے یہ دعوت نامے برطانوی سفارت خانے کے توسط سے حاصل



کیے ہوں گے۔

صبح کے ناشتے کی طرح کھانا بھی کمرے میں منگوا لیا گیا۔ کھانے کے دوران سلویا نے وہی بحث چھیڑ دی جو صبح ادھوری رہ گئی تھی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سلویا کی عجلت کے باعث اس بحث کا آغاز ہی نہیں ہو سکا تھا۔

لیکن اس بحث کا نتیجہ سلویا کی مرضی کے مطابق نہیں نکل سکا۔ میں آخر تک اپنے موقت پر ڈنار ہا۔ مال کار سلویا کو چپ ہو جانا پڑا اور وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

”تو پھر ایک ہی تدبیر ہو سکتی ہے۔“

”کیس تدبیر؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ اب مجھے پھر ایک بار جانا پڑے گا۔“

”کہاں؟“

لیکن سلویا نے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کھانا کھا چکنے کے بعد رخصت ہو گئی۔ نہ جانے کیا سوچا تھا اس نے؟ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گی وہ بہت ذہین تھی اور اس کے پاس وسائل بھی تھے۔ پورا برطانوی سفارت خانہ اس کی مدد کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہوگا۔

وہ تیسرے پہر کو واپس لوٹی اور اس نے بتایا کہ ہم اس پارٹی میں کس طرح شریک ہوں گے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbook.com

شام کو ہم پاتھا کی پراسرار کوٹھی کی طرف چل دیے۔ کوٹھی کے گرد آج بھی کل کا سا دیرانہ پھیلا ہوا تھا مگر کوٹھی آج ویران نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ نہ اسپراندھیرے کا راج تھا، نہ سنائے کا تسلط۔ آج وہ جلتے بجھتے قہقروں سے سچی ہوئی تھی۔ گیٹ سے لے کر کوٹھی تک اتنے بلب روشن تھے کہ رات پر دن کا گمان ہو رہا تھا۔

میں بلونت اور سلویا برطانوی ہائی کمیشن کے افسر کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ پاتھانے اپنے ہائی کمشنر کے اعزاز میں پارٹی دی تھی جو نیا نیا اس ملک میں تعینات ہوا تھا۔

”اس قسم کی پارٹیاں دینا پاتھا کی ہابی ہے۔“ سلویا نے مجھ سے کہا۔ ”وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے اس قسم کی تقریبات کرتا رہتا ہے۔ اس کے حلقہ احباب میں اس کی پارٹیاں خاصی مشہور ہیں۔“

ہال میں ہلکی ہلکی موسیقی لہریں لے رہی تھی اور ہال کے وسط میں چند جوڑے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ان لہروں پر بڑی ہم آہنگی سے ہلکے لے رہے تھے۔

میں متحس نظروں سے ایک ایک مہمان کا جائزہ لیتا رہا لیکن مجھے کیشپ دکھائی نہیں دیا۔ البتہ ششما نظر آئی۔ بلونت ہی

نے مجھے اس سے روشناس کرایا تھا۔ وہ اپنے کسی مہمان کے ساتھ محور رقص تھی۔ مجھے اس کے جسم کی چمک بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اس کے نقش و نگار خالص نیپالی نہ تھے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس میں کسی اور علاقے کے خون کی آمیزش بھی ہے۔

برطانوی ہائی کمیشن کے افسر جیرالڈ نے پاتھا سے میرا تعارف کرایا۔

”میرے دوست ارسلان ہیں۔ آرٹ تو جیسے ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ بڑی دل آویز تصویریں بناتے ہیں۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر ارسلان!“ پاتھا مسکرا کر بولا۔ ”کبھی آپ میرے وطن آئیے۔ آرٹسٹوں کے لیے نیپال کی سرزمین بھی بڑی خوبصورت ہے۔ خوبصورت اور متنوع!“

”اگر کبھی موقع ملا تو ضرور آؤں گا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ پاتھا نے مجھے شناخت نہیں کیا تھا۔

میں نے وہاں پر موجود کسی بھی شخص کی آنکھوں میں ایسی کوئی کیفیت محسوس نہیں کی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ مجھے پہچان لیا گیا ہے۔ وہاں سبھی اپنی دھن میں مست تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ کھنکتے ہوئے قہقہے ابل رہے تھے اور زندگی اپنی پوری شدت کے ساتھ اپنے وجود کا اظہار کر رہی تھی۔

اتنے میں ششما ہم لوگوں کی طرف نکل آئی۔ اس وقت پاتھا ہمارے ساتھ ہی تھا اس نے ہم سب کو اپنی بیٹی سے متعارف کرایا۔ ششما نے سب سے مصافحہ کیا اور رسمی جملے کہے لیکن مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی کیفیت اچانک کسی شرابی کی سی ہو گئی اس کی آنکھوں سے خمار جھانکنے لگا۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھ سے متاثر ہو گئی تھی اور یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ وہ میرے ہلکے سے اشارے پر پکے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں آگرے گی۔

”ششما دیوی!“ میں نے اپنے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ”میری خوش قسمتی ہوگی اگر آپ میری ہم رقص بننا پسند کریں۔“

ششما نے مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر ہاتھ آگے بڑھایا سلویا معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن بلونت کسی بت کی طرح ٹھس بیٹھا ہوا تھا۔

میں اور ششما ہلکورے لیتے ہوئے رقص جوڑوں کے حلقے میں شامل ہو گئے اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں اور دوسرا ہاتھ میرے کندھے پر تھا اور اس کی پتلی کمر میرے دوسرے ہاتھ کے حلقے میں تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس کی کمر پر اپنی گرفت سخت کرتا جا رہا تھا۔ وہ جدید ترین طرز کے مطابق ساڑھی باندھے ہوئے تھی اس لیے میرا ہاتھ اس کی نرم چکنی اور ریشم کی سی جلد پر پھسلے پھسلے رہ جاتا تھا کبھی کبھی پھسل بھی جاتا تھا اور اس خفیف سی مساس سے ششما ایک سکاری کے ساتھ ناگن کی طرح بل کھا جاتی تھی۔ اس کے سینے کا گداز اب میرے سینے میں پناہ لینے کے لیے مضطرب نظر آ رہا تھا اور اس نے اپنی ٹھوڑی میرے شانے پر رکھ



دی تھی۔ اس کے جسم کے نشہ خیز لمس سے میرے دماغ میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جذبات کے ناگ پھنکارنے لگے ہوں۔

جب موسیقی کا ریکارڈ ختم ہوا تو ہم دونوں ایک گوشے کی میز پر جا بیٹھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ششما کسی ناگن ہی کی طرح مست ہو چکی تھی اس کی آنکھوں کے گلابی ڈورے گہرے ہو چکے تھے اور پلکیں جیسے جھٹکی پڑ رہی تھیں سانسوں کی آمد و رفت میں انتشار سا تھا۔

”تم بہت اچھا ناچتی ہو ششما!“ میں نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ”شاید“ وہ مسکرائی اور پھر بڑے غور سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں۔“

یکھت میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ کیا ششما کو میری وہ تصویر یاد آرہی تھی جو اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔؟“

”شاید پچھلے جنم میں ہم دونوں ایک دوسرے کے کچھ رہے ہوں گے۔“ میں ہنس کر کہا۔

ششما جھینپ سی گئی۔ پھر اس نے شوخ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شریر بھی ہو اور گستاخ بھی۔“

”جب حسن بے پرواہ کی ہم جلیبی میسر آ جائے تو شرارت کو بھی جی چاہتا ہے اور گستاخی کو بھی۔“

قریب سے ایک ٹرائلی گزر رہی تھی جس پر مختلف مشروبات موجود تھے۔ ششما نے ٹرائلی روک لی اور مجھے پوچھا۔

”کیا پسند کرو گے؟“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

”آرنج اسکوائش۔“ کہتے ہوئے میں خود ہی گلاس اٹھالیا۔

”بس! ششما نے استعجابیہ لہجے میں کہا۔ شاید وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ میں کسی قسم کی شراب کا انتخاب کروں گا۔“

”اس وقت یہی جی چاہ رہا تھا۔“

آرنج اسکوائش کا ایک گلاس ششما نے بھی اٹھالیا اور ٹرائلی آگے بڑھ گئی۔

”تمہاری کوٹھی تمہاری ہی طرح خوبصورت ہے۔“ میں نے اسکوائش کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

”اگر کسی جگہ خوبصورت مہمان جمع ہو جائیں تو وہ جگہ اچھی لگنے ہی لگتی ہے۔“ ششما نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں ہی دل میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ چڑیا پوری طرح پھنس چکی ہے۔

بلونت اور سلویا بدستور اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے اور بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہماری طرف ان کی توجہ بالکل نہ ہو۔

دوسرے تمام مہمان اپنی اپنی دھن میں مست تھے۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی اور غالباً کوئی شخص مجھے پہچانا

بھی نہیں تھا۔ کم از کم اس وقت جب میں ششما کے ساتھ اس میز پر بیٹھا ہوا تھا مجھے یہی غلط فہمی تھی کہ میرے لیے کوئی خطرہ نہیں کھڑا ہوا ہے اور میں بالکل محفوظ ہوں لیکن کچھ دیر بعد پیش آنے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مجھے وہاں کئی افراد نے پہچان لیا تھا

اور پولیس کو اس کی اطلاع بھی دی چکا چکی تھی۔

کھانے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اس لیے ایک بار پھر موسیقی کا ریکارڈ لگا دیا گیا۔ ششما نے ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا اب رقص کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔؟

”مجھے اس ہجوم اور شور و غلب سے وحشت ہو رہی ہے۔ کیا کچھ دیر کے لیے اس ہال سے نجات نہیں مل سکتی؟..... مجھے خوشی ہوگی اگر تم مجھے اپنی کوٹھی کی سیر کراؤ!“ میں نے ششما سے کہا

”ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... چلو!“

ہم مہمانوں سے نظریں بچا کر ہال سے نکل گئے لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ سلویا اور بلونت ہماری اس حرکت سے بے خبر نہیں رہے تھے۔

میں نے ششما کا ہاتھ تھام لیا تھا اور میرے قدم اسی طرف اٹھ رہے تھے جدھر وہ مجھے لے جا رہی تھی۔ کوٹھی کے اندرونی حصے میں اندھیرا تھا ششما ہر کمرے کی لائٹ جلاتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے یہ بھی بتاتی جاتی کہ وہ کمرہ کس کام آتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ششما مجھے اس کمرے میں تو شاید ہرگز نہ لے جائے گی جہاں وہ تابوت رکھا ہوگا۔ اسی خیال کے پیش نظر میں جاگتے ذہن کے ساتھ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مجھے کوٹھی کے کس حصے میں لے جانے سے احتراز کرتی ہے۔ میں ششما کا ہاتھ دبا دبا کر کوٹھی کی آرائش و زیبائش کی تعریف بھی کرتا جا رہا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbook.com

”تو یہ ہے ہمارا غریب خانہ۔“ آخر ششما نے کہا۔

”کیا اوپری منزل نہیں دکھاؤ گی۔؟“

یکلخت ششما کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”لیکن اب کھانے کا وقت آچکا ہے۔“ اس نے مجھے ٹالنے کے لیے کہا۔ ”ہمیں اب ہال میں پہنچ جانا چاہیے۔“

”بس چند منٹ کی تو بات ہے۔ آؤ!“ میں نے اسے ایک طرف کھینچا۔ یہ میں نے دیکھ ہی لیا تھا کہ اوپری منزل کا زینہ کہاں ہے۔

ششما نے میرے اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیے لیکن زینہ طے کرتے ہوئے وہ کچھ پریشان اور کھوئی کھوئی سی تھی میں سمجھ گیا کہ تابوت اوپری منزل پر ہی ہوگا اور اسی لیے وہ مجھے وہاں لے جاتے ہوئے ہچکچا رہی ہے۔ گویا یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ اس تابوت میں کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے کچھ اسرار یقینا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ششما اس تابوت کو میری نظروں سے بچانے کی خواہش کیوں رکھتی۔؟

جب ہم اوپری منزل پر پہنچے تو اچانک مجھے کچھ یوں لگا جیسے کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہو۔ میں نے بڑی تیزی سے مڑ کر



دیکھا لیکن زینے پر کوئی نظر نہیں آیا۔ اسی وقت ششما بول پڑی۔

”کیا بات ہے؟“

”مجھے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے.....“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”ایسے موقعوں پر دل کو وہم گھیر لیتے

ہیں۔“

”کیسے موقعوں پر؟“

”جیسا موقع اس وقت ہے۔“ میں نے ششما کا ہاتھ دبا کر کہا..... ”یہ تنہائی کتنی دل کش، کتنی نشہ انگیز ہے۔

ششما نے قدم آگے بڑھا دیے لیکن اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل گئی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ مرزا خورشید جو بقول بلونت کے ششما کا محبوب تھا۔ آج کی تقریب میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ

ہوتا تو مجھے ششما کے ساتھ یہ تنہائی اور اس کا مہکتا ہوا قرب اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہو پاتا۔

ششما نے چند کمرے دکھانے کے بعد کہا۔ ”بس اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ دو تین کمرے رہ گئے ہیں جو میں دکھا بھی

نہیں سکتی۔ انہیں استعمال نہیں کیا جاتا اس لیے وہ ہمیشہ بند ہی رہتے ہیں۔“

اوپری منزل کے اس حصے میں بہت کم قوت کا بلب لگا ہوا تھا جس کی ملگجی روشنی میں مجھے ششما کے چہرے پر کچھ ایسے

تاثرات نظر آرہے تھے جن کو خوف سے ہی عبارت کیا جاسکتا تھا۔

دور مرگھٹ پر کوئی سیار چینا۔ اس کی آواز بہت مدھم ہو کر یہاں تک پہنچی تھی لیکن اس نیم تاریک ماحول میں وہ بڑی

بھیاں تک محسوس ہوئی۔ اس وقت مشکل ہی سے یقین کیا جاسکتا تھا کہ اسی عمارت کے ایک حصے میں جگمگ جگمگ کرتی ہوئی کوئی

تقریب برپا تھی۔

میں نے دونوں ہاتھ ششما کے شانوں پر رکھ دیے اور اس کی آنکھوں میں دیکھا ہوا بولا۔ ”تم کچھ خائف معلوم ہو رہی

ہو۔“

”نہیں..... تو.....“

میں نے اسے آہستگی سے اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ ایک بار پھر اس کے بدن کا تمام تر گداز میری گرفت میں

تھا۔ میرے ہونٹ اس کی گردن کا مساس کرنے لگے۔ فوراً ہی میں نے ششما کے بدن میں تناؤ محسوس کیا جیسے ستار کا تار کستا چلا

جار ہا ہو۔ اس کے دونوں ہاتھ میری پشت پر حرکت کرنے لگے تھے اور میرے تصور میں ایک خوابناک سانسوانی چہرہ ابھر آیا تھا۔

وہی نامعلوم اور دلکش چہرہ جو میرے جذبات کو مہمیز کرتا تھا۔ میں نے اپنے پیاسے ہونٹ ششما کے بھڑکتے ہوئے لبوں پر رکھ

دیے۔ اس کا کوئل بدن اندر سے دھک اٹھا ہوگا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ عالم کیف، رنگ لاتا،

مجھے ایک بات نے چونکا دیا۔ ہم جن کمروں کی طرف ابھی نہیں گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی ٹچلی درز میں روشنی نظر آرہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ذرا دیر قبل وہ سارے کمرے تاریک تھے۔

”یہ کیا؟“ میرے منہ سے نکلا۔

”کیا ہوا؟“ ششما کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ہمارے جسم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ ششما نے اس طرف دیکھا۔ جدھر میری نظریں تھیں۔ ٹھیک اسی وقت کمرے کی درز سے نکلتی ہوئی روشنی غائب ہو گئی۔ وہ کمرہ اب پھر تاریک ہو چکا تھا۔

ششما کے چہرے کی رنگت پھسکی پڑ گئی۔

”شاید کوئی چور گھس آیا ہے۔“ میں نے سرگوشی کی۔

مگر حقیقتاً میں نے ایسا نہیں سمجھا تھا۔ یہ بات میں نے محض اس لیے کہی تھی کہ ششما کو اس کمرے تک چلنے پر مجبور کر سکوں ویسے میں اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اس کمرے میں چند لمحے کے لیے روشنی ہونے کا کیا مطلب تھا؟..... بس اتنی سی بات سوچی جاسکتی تھی کہ اس کمرے میں کوئی موجود تھا۔ کسی وجہ سے اس نامعلوم ہستی نے کمرے میں روشنی کی ہوگی لیکن میری یا ششما کی آواز سن کر جلدی سے بٹن آف کر دیا ہوگا۔

”نہیں۔“ ششما میری بات کے جواب میں بولی۔ ”یہاں کوئی چور نہیں آ سکتا۔“

”ایک نظر دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔“

”لیکن اب ڈنر شروع ہو رہا ہوگا۔ ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“ ششما نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

لیکن میں اس موقع کو اتنی آسانی کے ساتھ ہاتھ سے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ششما کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹا ہوا اس کمرے کی طرف لے جانے لگا۔

ششما اب بھی احتجاج کر رہی تھی لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس کمرے کا دروازہ ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی کھلتا چلا گیا تھا۔ دوسری طرف مکمل تاریکی تھی۔ اس قسم کی کسی تجویز کا خیال میرے ذہن میں پہلے ہی تھا۔ اس لیے میں نے سلویا کے سامان میں نظر آنے والی ایک ٹارچ اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اب میں نے وہ فوراً جیب سے نکالی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا بٹن دبایا۔

کمرے کی تاریکی میں روشنی کا شگاف سا پڑتا چلا گیا۔ سامنے والی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا جو بند نظر آیا۔ لیکن میری آنکھیں اس دروازے کو دیکھنے سے پہلے اس تابوت کو دیکھ چکی تھیں جو کمرے کے وسط میں رکھا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بو کمرے کی فضا کو بوجھل کر رہی تھی میں نے ٹارچ کو بڑی تیزی سے ادھر ادھر گردش دی لیکن کمرے میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ مگر



کمرے کی صفائی اس بات کی مظہر تھی کہ اسے حال ہی میں صاف کیا گیا تھا کمرے کو کسی ذی روح سے خالی پا کر مجھے حیرت ہوئی۔ آخر لائٹ کس نے جلائی تھی۔؟

”لوٹ چلو! فوراً یہاں سے لوٹ چلو!“ ششما کی آواز میں بے پناہ وحشت تھی۔

لیکن کنوئیں کے قریب پہنچنے کے بعد پیاسا لوٹا حماقت ہی ہوتی میں ششما کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے تابوت کی طرف چھپنا۔ میں اسے کھول کر دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ اس میں راجکماری کلیدیب کور ہوگی۔ بند تابوت میں اسے زندہ رکھنے کے لیے آکسیجن وغیرہ کا بندوبست کر دینا کچھ ایسی زیادہ مشکل بات نہیں تھی۔

”نہیں..... نہیں..... نہیں.....“ ششما پاگلوں کی طرح سرگوشی کیے چلی جا رہی تھی۔

جیسے ہی میں نے تابوت کے ڈھکنے پر ہاتھ رکھا میرے دل کی دھڑکنیں بے حد تیز ہو گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ذی روح تنگ سی جگہ میں کروٹ لینے کی ناکام سی کوشش کر رہی ہو۔

### شکنجہ

قلمبہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ”ٹریک ٹو ڈپلومیسی“ کا غلط فہم کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جو رنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن..... اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ”بھولے بادشاہوں“ کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانسی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ”را“ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے ایکشن ایڈونچر جاسوسی سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

اپنے اعصابی تناؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس تابوت کو جلد از جلد کھول کر دیکھ لیتا۔

تابوت کا ڈھکنا خاصا وزنی تھا اسے اٹھانے کی کوشش میں نارچ میرے ہاتھ سے گر گئی کمرے میں ایک بار پھر مکمل اندھیرا چھا گیا۔ ششما کی ہلکی سی چیخ کمرے میں گونج اُٹھی۔ لیکن میں ڈھکنا کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا میں نے جلدی سے جھک کر فرش کو ٹٹولا۔ نارچ میرے پیروں کے قریب ہی گری تھی۔ اسلئے فوراً ہی مل گئی میں اسے سنبھالتا ہوا تیزی سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس کا رخ تابوت کی طرف کرتے ہوئے بن دبا دیا۔

روشنی ہوتے ہی کمرہ ایک بار پھر ششما کی چیخ سے گونج اُٹھا تھا۔ اور میری نظریں بھی تابوت پر اس طرح ساکت ہو گئی تھیں جیسے پتھر لگی ہوں۔ تابوت کا اندرونی حصہ بہت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر مٹلیں گدے لگے ہوئے تھے۔ مگر اس آرام دہ جگہ پر لیٹی ہوئی وہ چیز ہڈیوں کا ایک پنجر تھی۔ ایک انسانی ڈھانچہ! لیکن اگر وہ صرف ڈھانچہ ہی ہوتا تو شاید اتنا خوف ناک نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے جسم پر کہیں کہیں گوشت بھی موجود تھا۔ گوشت کے لوتھڑے سے چٹے رہ گئے تھے۔ داہنی آنکھ اپنے خلاء میں صحیح سلامت موجود تھی۔ لیکن بائیں آنکھ کی جگہ صرف گڑھا نظر آ رہا تھا۔ تاریک اور خوفناک گڑھا۔! داہنی آنکھ میں زندگی کی بھرپور چمک موجود تھی اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہی ہو۔

ششما میرے بازو سے لپٹ گئی تھی اور اس کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

دھنکا کمرے میں ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ گونج اُٹھی۔ سوکھی ہڈیوں میں جان پڑ گئی تھی اور ڈھانچے کی اکلوتی آنکھ نے بھی اب باقاعدہ جھپکنا شروع کر دیا تھا۔ ”ڈھانچے کا دایاں ہاتھ اب آہستہ آہستہ اوپر اُٹھ رہا تھا۔ ششما میرے بازو سے لگی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اور اس نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ ایک حیرت انگیز امر تھا کہ وہ چیخ مار کر بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ خود میرا یہ عالم تھا کہ سارے جسم میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں اور پسینے کے قطرات حشرات الارض کی طرح میرے جسم کے ایک ایک حصے پر سرسرا رہے تھے اس وقت میری جو کیفیت تھی میں اسے صحیح معنوں میں الفاظ کے زنداں میں نہیں لاسکتا۔

ششما نے اچانک ہسڑیائی انداز میں چیخنا شروع کر دیا مجھے اس کی چیخیں روکنے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ ٹھیک اسی وقت ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ میں نے ایک دم سرگھما کر تابوت کی طرف دیکھا کیونکہ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ ”تابوت بند نظر آیا۔ لیکن کمرے میں کوئی ایسی ہستی نہیں تھی۔ جو تابوت کو بند کر سکتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈھانچے نے خود ہی تابوت کا ڈھکنا بند کیا ہوگا۔

ششما کے منہ پر میرے ہاتھ کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ اس کی چیخیں رک گئی تھیں۔

”ہوش میں آؤ ششما! ہوش میں آؤ۔“ میں نے اس کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

ششما سسکیاں لینے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔



ہمیں..... ہمیں..... یہاں نہیں..... آنا چاہیے تھا۔“ وہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔ ”اب مجھے..... اس کی سزا..... برداشت کرنی پڑے گی۔“  
 ”لیکن ششما!“

اس سے پہلے کہ میرا جملہ پورا ہوتا۔ ”ہماری پشت پر ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور ہم چونک پڑے میں نے پاتھا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا وہ بہت ہی غصے میں معلوم ہو رہا تھا۔  
 ”ششما!“ وہ گر جا۔

”ششما روتی ہوئی اس کے قدموں گر پڑی۔ وہ نیپالی زبان میں کچھ کہہ بھی رہی تھی جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ پاتھا بھی نیپالی زبان ہی میں اس پر گرج برس رہا تھا اور اس وقت میری حالت یہ تھی جیسے مجھے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔  
 آخر پاتھا میری طرف مڑا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ”آپ میرے مہمان ضرور ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ میری کوٹھی میں ہر جگہ دندنا تے پھریں۔“ میں نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ پاتھا اس وقت یہاں کیسے پہنچ گیا۔ اسے کیونکر معلوم ہو سکا کہ کوئی اس کمرے تک پہنچ گیا ہے اس سلسلے میں لے دے کر ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ ملحقہ کمرے میں بھی کوئی موجود تھا۔ غالباً روشنی بھی اسی نے کی تھی۔ اور ہمارے بارے میں اطلاع بھی اسی نے پاتھا کو دی ہوگی۔ دوسرے کمرے میں ٹیلیفون ضرور ہوگا جس پر وہ پاتھا سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔  
 ”آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں!“ پاتھا کی گرجدار آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔  
 ششما ابھی تک پاتھا کے قدموں میں پڑی ہوئی سسک رہی تھی۔  
 ”کیا آپ نے سنا نہیں؟ پاتھا مجھی سے مخاطب تھا۔“

میری شدید ترین خواہش تھی کہ دوسرے کمرے میں موجود پراسرار شخص کو دیکھ لوں مگر قسمت میری اس خواہش کو آسودہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی میں محسوس کر رہا تھا کہ پاتھا اب مجھے ایک منٹ کے لیے بھی وہاں نہیں رکنے دے گا۔ میں خاموشی سے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دوسرے کمرے میں موجود وہ شخص دروازے کی جھریوں سے یا کسی سوراخ سے میری دیکھ رہا ہے۔

کمرے سے باہر نکلنے ہی میں تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ میرا رخ زینے کی طرف تھا مگر ذہنی رداب بھی اسی کمرے کی طرف رہی تھی۔ جہاں ایک پراسرار تابوت میں وہ زندہ ڈھانچہ محو استراحت تھا۔  
 میں تیزی سے زینے طے کرتا چلا گیا۔ زینے کے اختتام پر سلویا سے ٹکرا گیا۔  
 خدا کا شکر ہے کہ تم مل گئے!“ وہ چھوٹے ہی بولی اور پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے

ہال کی طرف لے جانے کی بجائے کسی اور سمت میں لے جا رہی تھی۔

ششما کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ ایک مفصل کہانی ہے مگر تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟“

”تمہیں بلاتا خیر یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے ورنہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ ہال میں پولیس موجود ہے۔ کچھ لوگوں نے

تمہیں پہچان لیا تھا اور یہاں پر تمہاری موجودگی کی اطلاع پولیس ہیڈ کوارٹر کو دے دی تھی۔“

”اوہ! میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔“

”تم نے میک آپ کے بغیر یہاں آ کر بہت بڑی حماقت کی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ تم اس وقت ہال میں نہیں تھے ورنہ

پکڑے جاتے۔“

”لیکن اب تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟“

”یہاں کوئی عقبی دروازہ ضرور ہوگا اور میں اسی کی تلاش میں ہوں۔“

”بلونت کہاں ہے؟“

”وہ ہال ہی میں ہوگا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ وہیں رک کر حالات پر نظر رکھے۔“ سلویا نے بتایا۔

میری ذہنی رواں وقت دو مختلف سمتوں میں بہہ رہی تھی مجھے اس نئی صورت حال سے بھی نبرد آزما ہونا تھا اور اس پر اسرار

تابوت کی خلش بھی بے چین کیے ہوئے تھی۔ ان لمحات میں جبکہ میں سلویا کے ساتھ بھاگ رہا تھا میرے ذہن کے ایوانوں میں

ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ گونج رہی تھی۔ ایک استخوانی ڈھانچہ میرے تصور کے پردے پر جیسے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ آخر وہ سب کیا

چکر تھا۔ کیا اس منحوس کیشپ کے پاس کچھ شیطانی قوتیں بھی تھیں۔؟ میرا ذہن اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

سلویا عقبی دروازہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ ہم اس راستے باہر نکلے۔ یہاں دور تک اندھیرے کی حکمرانی تھی۔

”کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ سڑک کس طرف ہے؟“ سلویا بولی۔

”کیا یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل بات ہے؟“ جواب دیتے ہوئے میرا منہ بن گیا۔

”بس تو پھر تم سڑک پر پہنچ کر کوئی ایک میل آگے نکل جاؤ میں گاڑی لے کر آتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم آؤ۔ بلونت کو بھی لیتی آنا۔“

سلویا واپس عمارت میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

میں اندھیرے میں ایک طرف چل پڑا۔ ٹارچ جلانا مناسب نہ ہوتا اس لیے مجھے کئی جگہ ٹھوکریں بھی کھانی پڑیں۔ جیسے

تیسے میں سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ سڑک پر جس جگہ میں نے قدم رکھا وہاں سے پاتھ کی کوٹھی کا فاصلہ کوئی ایک فرلانگ



ہوگا۔ روشنی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور اسکے دائیں بائیں شیب سا تھا۔

ابھی میں نے بمشکل نصف میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سڑک پر روشنی سی لہرائی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ایک کار تیز رفتاری سے آگے بڑھتی چلی آرہی تھی۔ میں نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ اب اس کی تیز روئی مجھے زد میں لیے ہوئے تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ اس گاڑی کے پیچھے ایک اور کار بھی تھی میں الجھن میں پڑ گیا۔ اندھیرے میں ان گاڑیوں کی ساخت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ نہ جانے ان میں سے سلویا کی گاڑی کون سی تھی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں میں سے کوئی گاڑی بھی سلویا کی نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرا اٹھا ہوا قدم لاشعوری طور پر گر گیا۔

کار اب بالکل قریب آچکی تھی۔ اگر وہ سلویا ہی کی تھی تو یقیناً رک جاتی کیونکہ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے دیکھا جا چکا ہوگا۔

دفعۃً میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اُنھیں آنے والی کار کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اور وہ کسی قدر ترچھی ہو کر سیدھی میرے اوپر آرہی تھی۔ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ ڈرائیونگ کرنے والا مجھے کچل ڈالنا چاہتا ہے کار بالکل میرے سر پر آچکی تھی میں نے بے تحاشہ نشیب کی طرف جست لگائی مگر دو تین سیکنڈ کی تاخیر ہوئی گئی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا جسم کار کے کس حصے سے ٹکرایا تھا۔ بس مجھے اپنے جسم پر دھماکہ سا محسوس ہوا اور میں نے خود کو فضا میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔ پھر ایک دھماکے کے ساتھ میں زمین پر گرا میرے حواس منتشر ہو چکے تھے۔ میں جس جگہ گرا تھا وہاں کوئی خاردار جھاڑی رہی ہوگی کیونکہ میرا آخری احساس یہ تھا کہ میرے جسم میں متعدد سونیاں سی پیوست ہو گئی تھیں اور شاید میں بے ہوش ہونے سے قبل سسک بھی اٹھا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک سجے ہوئے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور دیواروں پر لگے ہوئے مرمری بلب تیز نیلگوں روشنی پھیلا رہے تھے۔ سلویا میرے بستر کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں کھلتی دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی۔

”تم بہت ڈھیٹ ہو مجھے اب تمہارے دشمنوں سے ہمدردی ہو چلی ہے۔ ان بیچاروں کی کوئی کوشش بھی تو کامیاب نہیں ہو سکی۔! متعدد حملے کر چکے ہیں وہ تم پر۔“

لیکن میں نے سلویا کے اس شوخ تبصرے پر اظہار خیال کرنے کی بجائے اس سے یہ پوچھا کہ میں کہاں ہوں یہ کمرہ مجھے اس ہوٹل کا نہیں معلوم ہوا تھا۔ جہاں ہم مقیم تھے۔

”تمہیں اس کوٹھی میں بلونت لایا ہے۔“ سلویا نے بتایا۔ ”یہ مہاراجہ زرنجن پور کی کوٹھی ہے۔ تم کو اس حالت میں ہوٹل نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ لیکن بلونت کی وجہ سے یہ مسئلہ طے ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس گاڑی میں خود کیسپ تھا جس نے تمہیں ٹکڑا کر ماری تھی۔“

”اور پیچھے والی گاڑی تمہاری تھی؟“

”ہاں..... لیکن اس وقت مجھے یہ شبہ نہیں تھا کہ اس گاڑی میں تمہارے دشمن ہوں گے۔ یہ احساس تو اس وقت ہوا جب اس گاڑی نے تمہیں ٹکرایا اور تم اچھل کر نشیب میں جا گرے۔ اس وقت شاید زندگی میں پہلی مرتبہ میں کچھ زروس ہو گئی تھی۔ میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس گاڑی کا تعاقب کروں یا تمہاری خبر لی جائے۔ بہر حال صحیح یا غلط، میں نے فیصلہ کیا کہ تمہاری خبر لینا ضروری ہے۔ بریک تو میں نے لگا ہی دیے تھے۔ گاڑی رکتے ہی بلونت نے دروازہ کھول کر نشیب میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی تم تک پہنچی۔ تم بے ہوش تھے اور جسم کے بعض حصوں سے کچھ خون بھی رس رہا تھا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ تمہاری حالت خطرناک نہیں ہے۔ ہم تمہیں اٹھا کر گاڑی تک لے گئے اور تمہیں پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ تمہیں ٹکڑے والی کار راتنی دیر میں غائب ہو چکی تھی۔“

سلویا کا بیان سنتے ہوئے میں ذہنی طور پر اپنے جسم کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی کہ مجھے کوئی خطرناک چوٹ نہیں لگی تھی۔ صرف کولہے کی ہڈی میں درد تھا جو غالباً ایک دو روز میں ختم ہو جاتا۔ کانٹوں سے جو معمولی زخم آئے تھے ان پر دوا لگی ہوئی تھی۔

”ہیلو!“ بلونت کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا۔ ہوش آ گیا تمہیں؟“

”ہاں.....“ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر نے کہا تھا کہ جب تمہیں ہوش آئے تو تم سے سب سے پہلے یہ پوچھا جائے کہ جسم کے کسی حصے میں تکلیف تو نہیں؟“

”کولہے میں درد ہے۔“

”زیادہ؟“

”نہیں زیادہ تو نہیں ہے مگر شاید چلنے میں کچھ زیادہ ہو۔“

”گویا تشویش کی کوئی بات نہیں؟“

”قطعاً نہیں۔“

”خیر میں ڈاکٹر کو اس کی اطلاع دیئے دیتا ہوں۔“ بلونت یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔

سلویا نے مجھے بتایا کہ مہاراج ایک تنخواہ دار ڈاکٹر مستقل طور پر کوٹھی کے ایک حصے میں رہتا تھا اور اسی نے میری دیکھ بھال کی تھی۔

”پاتھا کی کوٹھی سے میرے غائب ہوجانے کا پولیس پر کیا ردِ عمل ہوا تھا؟“ میں نے سلویا سے پوچھا۔



”بس وہ پریشانی کے عالم میں تمہیں ادھر سے ادھر ڈھونڈتے پھر رہے تھے میرے سفار خانے کے افسر کو خاصی پریشانی اٹھانا پڑی کیونکہ اسی نے تمہیں اس محفل میں ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ پولیس نے اس سے خاصی پوچھ گچھ کی اور اسے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑانی پڑی کہ وہ تمہیں زیادہ عرصے سے نہیں جانتا تھا اور یہ کہ تم سے کسی تقریب ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔ ازاں بعد زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوئی تھیں اور تمہاری رہائش گاہ سے بھی واقف نہیں ہے۔“

”پولیس اور کیشپ!“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ میں دوطرفہ حملوں کی زد میں ہوں۔“

”کیا تم اس تابوت کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔؟“

”ہاں۔“

پھر؟ سلویا نے بے تابلی سے پوچھا۔ کیا اس میں؟“

”کلبیب کو نہیں تھی اس میں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن جو کچھ بھی تھا اس پر یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”یعنی؟“

”زندہ ڈھانچہ۔“

”کیا مطلب؟“

میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ دہرا دیا۔ سلویا نے وہ سب کچھ ایسے انداز میں سنا جیسے سمجھ رہی ہو کہ میں اسے بیوقوف بنا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ واقعہ ایسا نہیں تھا جس پر آسانی سے یقین آ سکتا۔

اتنے میں بلونت واپس لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں کسی قسم کے لوشن کی شیشی تھی۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کوہے پر اس لوشن کی مالش کی جائے گی۔“

”کیا تم میرے لیے کھانے کا بندوبست نہیں کر سکتے؟ میں اب کافی بھوک محسوس کر رہا ہوں۔“

”ہم نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ ساتھ ہی کھائیں گے۔!“ سلویا بولی۔

”اسی کمرے میں منگوا لوں یا تم ڈاننگ روم تک چل سکو گے؟“ بلونت نے مجھ سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ میں چل تو سکتا ہوں لیکن شاید اس سے تکلیف بڑھ جائے اس لیے یہیں منگوا لو۔!“

بلونت نے میری تجویز کے مطابق کھانا وہیں منگوا لیا اور ہم تپائی کے گرد پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر کھانے میں مشغول ہو گئے۔ کھانے کے دوران میں سلویا نے بلونت کو ان باتوں سے آگاہ کیا جو اسے مجھ سے معلوم ہوئی تھیں۔ جو رد عمل سلویا پر ہوا تھا وہی بلونت پر ہوا۔

”کیا یہ ممکن ہے!“ بلونت نے بے ساختہ کہا تھا۔

”ممکن ہو یا نہ ہو لیکن اتنا بہر حال طے ہے کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔“ میں منہ بنا کر بولا۔

”خیر خیر!“ سلویا نے میری چڑچڑاہٹ کو محسوس کر کے کہا۔ ”اب سوال یہ ہے کہ آئندہ کے لیے تمہارا کیا پروگرام ہے۔؟“

”میں فی الحال راجکاری کی بازیابی کے سوا کوئی اور بات سوچ ہی نہیں سکتا۔“

”تمہارے خیال میں یہ بازیابی کیونکر ممکن ہوگی؟“

”کیشپ کے پیچھے لگ کر۔“

”لیکن کیشپ تمہاری نظروں میں نہیں ہے۔“

”پا تھا تو ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اگر میں پا تھا کے قریب رہ سکوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں

کیشپ سے دور نہیں ہوں۔“

”پا تھا تو دو ایک روز میں یہ ملک چھوڑ دے گا۔“

”میں پاتال تک اس کا تعاقب کروں گا۔“

سلویا چپ ہو گئی۔ بلونت بھی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا میں نے اسے مخاطب کر کے کہا: ”تم پا تھا پر کڑی نظر رکھو کل شام

تک یا زیادہ سے زیادہ پرسوں صبح تک میرے کوہے کی تکلیف ختم ہو جائے گی اور پھر میں بھی.....“

”میدان عمل میں آ جاؤں گا۔“ سلویا نے مسکرا کر میرا فقرہ مکمل کر دیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد کافی کا دور چلا اور اس کے

بعد بلونت نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب سونے کی تیاری کرنا چاہیے کیا خیال ہے مس سلویا۔“

”یقیناً۔“

”تو پھر چلیے میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔“

”چلیے۔“

ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا مجھے ڈرتھا کہ سلویا کسی بہانے سے اسی کمرے میں نہ

رک جائے اگر ایسا ہوتا تو میرے لیے بڑی مصیبت ہوتی۔ میرے کوہے میں تکلیف تھی اور میں تھکا تھکا سا بھی تھا اس لیے کم از کم

آج کی رات سلویا کی وحشت کا ساتھ نہ دے پاتا۔

مگر تھکن کے باوجود مجھے بستر پر لیٹتے ہی نیند نہیں آ سکی۔ ذہن میں خیالات کا تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ کبھی تصور میں

استخوانی ڈھانچہ لہرانے لگتا اور کبھی ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دینے لگتی کبھی کیشپ کی سرخ سرخ آنکھیں یاد آئیں اور کبھی ششما

کے مہکے ہوئے جسم کا رنگین خیال مجھے بے چینی سے کروٹ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اسی عالم میں کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا اور اس وقت



جب کچھ غنودگی سی طاری ہو گئی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ دروازے پر ہوئی دستک کا انداز بڑا محتاط تھا۔ جیسے دستک دینے والا یہ چاہتا ہو کہ دستک کی آواز میرے علاوہ کسی کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ مجھے فوراً سلویا کا خیال آیا۔ دستک دینے والی وہی ہو سکتی تھی۔ اس قسم کی عورتیں ایک رات بھی بے کیفی سے نہیں گزار سکتیں، لیکن میں آج رات سلویا کے جذبات کی آگ پر شبنم افشانی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

مدھم مدھم دستک دو تین مرتبہ پھر ہوئی لیکن میں بڑے اطمینان سے دوبارہ بستر پر لیٹ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد دستکیں بند ہو گئیں اور سناٹا چھا گیا اس خیال سے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی کہ سلویا اس وقت بہت جھنجھلائی ہوگی۔ دوسری صبح بلونت اور سلویا نے ناشتہ بھی میرے کمرے میں آکر کیا اور مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا آج وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی بے تکلف تھے۔ اس کی وجہ بھی جلد ہی میرے سمجھ میں آ گئی۔ غالباً کل رات میری طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد سلویا نے بلونت پر جال پھینکا ہوگا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئی ہوگی۔

ناشتہ کر چکنے کے بعد وہ دونوں مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ بلونت کو پاتھا کی خبر لینی تھی اور سلویا کو بھی کوئی کام ہوگا۔ دوپہر تک میں بستر پر پڑا سگریٹ پھونکتا رہا۔ کھانے کے وقت تک ان دونوں میں سے کوئی واپس نہیں لوٹا تو میں نے گھنٹی بجا کر ملازم کو بلایا اور ان سے کھانے کے لیے کہا۔

تیسرے پہر کی چائے بھی مجھے تنہا پینی پڑی تھی۔ میرے کولہے کا درد اب بڑی حد تک کم ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں نے ڈاکٹر کے دیے ہوئے لوشن کی مالش صرف دو ہی مرتبہ کی تھی۔

شام کے قریب میں نے راہداری میں قدموں کی آہٹیں سنیں غالباً سلویا اور بلونت لوٹ آئے تھے لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ قدموں کی آہٹیں دو سے زیادہ افراد کی ہیں۔ وہ کم از کم تین ضرورت تھے لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ تیسرا کون تھا۔“

دروازہ کھلا اور وہ تینوں کمرے میں آ گئے۔ سلویا اور بلونت کے ساتھ اس تیسری ہستی کو دیکھ کر میں بستر پر اچھل پڑا تھا۔ یہ بات میرے سان وگمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ وہ تیسری ہستی انسپکٹر جوگیندر کی ہوگی۔

”ہیلو!“ انسپکٹر جوگیندر کا لہجہ بڑا دوستانہ تھا۔

میں بستر سے اٹھ بیٹھا حیرت اور پریشانی کے تاثرات میرے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئے ہوں گے بلونت اور سلویا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی وہ دونوں میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

”تشریف رکھیے انسپکٹر!“ بلونت نے جوگیندر سے کہا۔

”شکریہ..... لیکن پہلے میں ان سے ملاقات کر لوں۔“ جوگیندر یہ کہتے ہوئے میرے قریب آ گیا تھا۔ اس نے مصافحے



کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بھی بے وقوفوں کی طرح ہاتھ آگے کر دیا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

سلویا نے قریب آ کر میرا بازو پکڑا اور پھر مجھے کرسیوں کی طرف لے جاتی ہوئی بولی۔ ”اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو ہوگی۔“ ہم چاروں، کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میرا ذہن بہت بری طرح الجھ رہا تھا جو گیندر کی رفاقت میں یہ ماحول مجھے ایک خواب محسوس ہو رہا تھا۔

جو گیندر نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”غالباً مجھے سب سے پہلے آپ کو یہ اطمینان دلانا چاہیے کہ اب آپ کو پولیس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”وجہ“ میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

”دراصل ایک اہم شخصیت نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ آپ نہ تو خود مجرم ہیں اور نہ کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اب تک پولیس کی نظروں میں آپ ایک پراسرار انسان تھے لیکن اتنے بڑے شخص کی ضمانت کے بعد ہمیں یقین کرنا ہی پڑا ہے کہ ہم بلا وجہ آپ کے چچھے لگ تھے۔ ویسے میرے محکمے کو یہ بات اب تک نہیں معلوم ہو سکی ہے کہ آپ کون ہیں۔“

میری ضمانت دینے والا شخص ہے۔

”اصل شخصیت سے تو میں خود بھی واقف نہیں ہوں۔ مجھے صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ آپ کا پیچھا چھوڑ دیا جائے کیونکہ آپ کی ضمانت برطانیہ کی ایک مقتدر ہستی نے دے دی ہے۔“

اس جواب پر میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

حیرت کی زیادتی کے باعث میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔ جو گیندر کہہ رہا تھا: ”مجھے ہدایات ملی ہیں کہ آپ سے ملوں، آپ کی الجھنوں کے بارے میں معلومات کروں اور سلسلے میں آپ سے مکمل تعاون کروں۔ مجھے بتائیے کہ پولیس آپ کی کیا مدد کر سکتی ہے اور وہ لوگ کون ہیں جو آپ کی جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔“

”کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتا ہوں لیکن اگر آپ مجھ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں تو وقتاً فوقتاً میرے پیغامات آپ کو ان کے توسط سے ملتے رہیں گے۔“ میں نے سلویا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انہی سے آپ کو معلوم ہوتا رہے گا کہ آپ کو کس سلسلے میں میری کیا مدد کرنا ہے۔“

”بہتر ہے۔“

اتنے میں ایک ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں لایا۔ بلونت نے پہلے ہی سے اس سلسلے میں ہدایات دے دی ہوگی۔ ہم لوگ چائے پینے کے دوران میں گفتگو کرتے رہے۔ چائے پی چکنے کے بعد جو گیندر نے جانے کی اجازت چاہی۔ بلونت اسے بیرونی دروازے تک چھوڑنے چلا گیا۔ میں سلویا کو گھورنے لگا۔ کیونکہ میرے خیال میں حالات کا یہ موڑ اسی کی وجہ سے



سامنے آ سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ سلویا میری نظروں کا مطلب سمجھ کر مسکرائی۔ ”تم نے غلط نہیں سمجھا میں نے ہائی کمیشن کے ذریعے سے اپنی مفصل رپورٹ لندن بھیج دی تھی۔ وہاں سے غالباً خود ہر میجسٹری نے حکومت سے رابطہ قائم کیا ہوگا اور تمہارے سلسلے میں ہدایات دی ہوں گی۔ پھر حکومت نے یہاں کے پولیس چیف سے رابطہ قائم کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ تمہارے معاملے میں برطانوی ہائی کمیشن سے رابطہ قائم کرے چونکہ تمہارا کیس جو گیندر کے پاس تھا اس لیے اسے ہائی کمیشن بھیجا گیا۔ وہاں اس سے میں نے ملاقات کی اور پھر اسے یہاں لے آئی۔“

”بلونت بھی تو تھا تمہارے ساتھ۔“

”وہ راستے میں مل گیا تھا۔“

”ہوں۔“ میں چند لمحے سوچتا رہا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میری شخصیت پر پھیلے ہوئے اسرار کے بادل نہ جانے کب چھٹیں گے۔“

”اگر تم میرے ساتھ لندن چلے چلو تو.....“

”راجکاری کی بازیابی سے پہلے یہ ناممکن ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بعد کے دو روز میں نے اسی عمارت میں گزارے میرے کو لہے کی تکلیف بالکل ختم ہو چکی تھی اور میں بہ آسانی چل پھر سکتا تھا۔ لیکن مجھے باہر نکلنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں پیش آئی تھی۔ سلویا اور بلونت سرگرم عمل تھے مجھے تمام رپورٹیں مل رہی تھیں۔ اور انسپکٹر جو گیندر کا مکمل تعاون بھی حاصل تھا۔

پاتھار وانگی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے ہوائی سفر کی بجائے بحری راستے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ سیدھانپال جانے کی بجائے پہلے سری لنکا جا رہا تھا۔ بعد میں یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ اس کی بیوی کا تعلق سری لنکا ہی سے تھا۔ وہ وہاں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور آج کل اس کا قیام وہیں تھا۔ اسی کی وجہ سے پاتھار وہاں جا رہا تھا۔ وہ چند دن وہاں رکنا اور پھر اپنی بیوی کو لے کر نیپال روانہ ہو جاتا۔

بظاہر پاتھار کی ہمسفر رفیق صرف ششما ہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ کیشپ بھی اسی جہاز میں سفر کرے گا۔ اسی لیے میں نے بھی اسی جہاز میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سلویا اور بلونت بھی میرے ساتھ ہوتے۔ ہمارے سفر کی تمام تیاریاں جو گیندر کروا رہا تھا۔ پاسپورٹ اور دوسرے تمام ضروری کاغذات اسی نے تیار کروائے تھے۔ جہاز میں تین کیبنوں کی بکنگ بھی کروالی تھی۔

چوتھے روز ہم روانہ ہو گئے۔

چھٹے روز ہم جہاز پر پہنچے۔ میری کوشش یہ تھی کہ جہاز کی روانگی سے قبل کسی مسافر کی نظریں مجھ پر نہ پڑنے پائیں۔



دراصل میں پاتھا اور ششما سے بچنا چاہتا تھا۔ اور اس بات کے بھی قومی امکانات تھے کہ کیشپ بھی جہاز پر موجود ہو مجھے اس کی نظروں سے بھی بچا رہنا تھا۔ ہاں البتہ جہاز کی روانگی کے بعد مجھے اس کی کوئی پروا نہیں رہ جاتی میں اب یہی چاہتا تھا کہ دشمنوں سے کھل کر مقابلہ ہو جائے۔ آنکھ مجھوں سے تو اب وحشت ہونے لگی تھی۔ بادل اگر ایک مرتبہ کھل کر برس جائیں تو مطلع صاف ہو جاتا ہے اور میں اب اس گھٹن اس جس سے تنگ آچکا تھا۔

صبح پانچ بجے جہاز نے ساحل چھوڑا اور میں نے کیمین میں بستر پر لیٹے لیٹے اطمینان کی سانس لی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی تک کسی کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔

سات بجے میں نے اپنے کیمین ہی میں ناشتہ کیا۔ سلویا اور بلونت بھی وہیں آگئے تھے۔ ناشتے کے دوران میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ دونوں چلے گئے۔ اور میں سونے کے خیال سے بستر پر لیٹ گیا کیونکہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹی تھی۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ تاہم مجھے لیٹتے ہی نیند نہیں آسکی۔ کچھ دیر تک مختلف النوع خیالات ذہن میں چکراتے رہے۔ یہ سوال میرے ذہن میں گونج سی پیدا کرتا رہا کہ اس بحری سفر میں کیا گیا گل کھلیں گے؟ جو گیندر کے ذریعے سے یہ رپورٹ مجھے مل ہی چکی تھی کہ پاتھا کے سامان کے ساتھ ایک تابوت بھی جہاز پر بار کیا گیا تھا۔ اور تابوت ہی کی وجہ سے مجھے اس بات کا یقین ہوا تھا کہ کیشپ بھی جہاز پر موجود ہوگا۔

”تابوت! ہڈیوں کے ڈھانچے کا مسکن!“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

ہڈیوں کا ڈھانچہ..... ایک راز!

میرا ذہن اس منتشر خیالات سے الجھتا ہوا بالآخر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ پھر میری آنکھ تین بجے کے قریب کھلی تھی۔ میں بھوک محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اتنا وقت گزر جانے کے بعد میں نے کھانا مناسب نہیں سمجھا اور چائے کے ساتھ ہلکا سا ناشتہ کر لیا۔ رات کا کھانا کھانے کے لیے میں نے سلویا اور بلونت کے ساتھ ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔ ہم ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے ہی تھے کہ میرے ذہن کو ایک جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔

کیشپ کا پراسرار وجود میرے سامنے تھا۔ اپنی اسی وضع قطع کے ساتھ جس میں وہ مجھے پہلی مرتبہ نظر آیا تھا۔ وہی لمبا سا چنڈ، وہی بے ترتیب سی داڑھی اور کانوں میں ویسے ہی بڑے بڑے سے بالے!

بلونت اور سلویا بھی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے تھے۔ وہ ڈائننگ ہال سے باہر جا رہا تھا اور ہم ہی لوگوں کو دیکھ کر وہ بھی ٹھٹھکا تھا۔ اب اس کی نظریں میری نظروں سے ملی ہوئی تھیں۔ ان سرخ سرخ آنکھوں سے جیسے کوئی برقی روح خارج ہو کر میری آنکھوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا تھا۔ جیسے وہ برقی روح میرے پورے وجود کو مفلوج کر کے رکھ دے گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے غالباً میرے ذہن کی پراسرار قوت بھی حرکت میں آگئی مجھے خود بخود یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے کیشپ کی آنکھوں



سے خارج ہونے والی برقی رو کو میری آنکھیں بھر پور جواب دے رہی ہوں۔ فوراً ہی کیشپ نے مجھ سے نظریں چرائیں اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا، میرے پہلو سے نکل کر ڈاننگ ہال سے باہر چلا گیا۔

اب یلخت میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ ذہن پر اچانک جو ایک بوجھ سا آ پڑا تھا اس سے نجات مل گئی تھی میں نے سلویا اور بلونت کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ میں خفیف سا مسکرا دیا اور پھر سرگوشی کرنے والے انداز میں بولا۔

”میں نے کہا تھا، کیشپ بھی اس جہاز پر ہوگا۔“

”وہ تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا ہے۔“ سلویا بولی۔

”ظاہر ہے کہ اسے اس کی توقع نہیں ہوگی۔“

بلونت جو ڈاننگ ہال میں نظریں دوڑانے لگا تھا، آہستہ سے بولا۔ ”پاٹھا اور ششما بھی موجود ہیں یہاں۔“

میری اور سلویا کی نظریں اس طرف گئیں جدھر بلونت دیکھ رہا تھا۔ ششما اور پاٹھا ایک میز پر بیٹھے ہوئے غالباً چائے یا کافی پی رہے تھے ان کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا لیکن یہ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ کیشپ انہی کی میز سے اٹھ گیا ہوگا۔

”انہوں نے ہمیں اب تک نہیں دیکھا ہے۔“ بلونت نے خیال ظاہر کیا۔

”تو اب دیکھ لیں گے۔“ میں نے لا پرواہی سے شانہ جھٹک کر کہا اور قدم آگے بڑھائے۔

سلویا اور بلونت نے میری تقلید کی تھی۔ میں نے اس میز کا انتخاب کیا جو پاٹھا کی میز کے قریب تھی میں چاہتا تھا کہ وہ دونوں مجھے دیکھ لیں جیسے ہی ہم کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھے، ششما کی نظریں ہم پر پڑ گئیں۔ یلخت س کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ وہ اس طرح میری طرف دیکھتی رہ گئی تھی جیسے کسی نے اس پر سحر کر دیا ہو میں نے دوستانہ انداز میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔ اور مسکرایا لیکن ششما نے اس مسکراہٹ کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خوفزدہ سی معلوم ہو رہی تھی۔ غالباً پاٹھا نے اس کی یہ بدلتی ہوئی کیفیت محسوس کر لی تھی۔ اس نے فوراً سر گھما کر دیکھا اور پھر اس کا منہ بھی حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ایک ویٹر ہمارے قریب آ گیا تھا اور سلویا اسے کھانے کے بارے میں ہدایات دینے لگی تھی۔ بلونت کنکھیوں سے پاٹھا کی میز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پاٹھا نے اب ہماری طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ ششما سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر وہ دونوں بیک وقت اپنی کرسیوں سے اٹھے اور ہال کے دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ششما اپنے باپ سے ایک قدم پیچھے تھی۔ ہال سے نکلتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا تھا اور اس کے چہرے سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی جس کا اسے موقع نہیں مل سکا تھا۔

”مجھے اب فضا میں تناؤ محسوس ہونے لگا ہے۔“ سلویا ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔



”وہ تو ظاہر ہے کہ محسوس ہوگا کیونکہ اب دو حریف کھل کر مقابلے پر آگئے ہیں۔ اب کوئی آنکھ مچولی نہیں کھیلی جاسکے گی۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وار کیے جاسکیں گے۔“ میں نے کہا اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ میرے لہجے میں جوش و خروش تھا۔

یہ ایک غلط بات ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ میرے جوش و خروش کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ حقیقتاً یہ ایک بہت بڑا سبب تھا کہ اب میرے ہاتھ بھی کیشپ تک پہنچ سکے تھے۔ اب ایسی صورت حال نہیں تھی کہ بوڑھا کیشپ بھی مجھ سے اس طرح کھیل سکتا جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔ اب تو برابر کی چوٹ تھی۔ اب نہ تو میں کیشپ سے بھاگ سکتا تھا اور نہ کیشپ کو مجھ سے دستگاری مل سکتی تھی۔ بلونت کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ کر میں نے کہا۔ ”کیا تم خوفزدہ ہو میرے دوست۔“

”نہیں.....“ بلونت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ میں صرف اس خیال سے پریشان ہوں کہ راجکماری کا کوئی سراغ اب تک نہیں ملا ہے۔“

”کیشپ ہی کو سراغ سمجھو! مجھے یقین ہے کہ اب ہم بہت جلد راجکماری تک پہنچ جائیں گے۔“

ویٹر کھانا لے کر آگیا تھا اس لیے گفتگو کا سلسلہ رک گیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد کھانا بھی شروع ہوا اور باتیں بھی دوبارہ چھڑ گئیں سلویا بار بار مجھے یہ تلقین کر رہی تھی کہ پوری طرح چوکنا رہوں کیونکہ اس مرتبہ کیشپ کی طرف سے کسی بھرپور وار کا قوی امکان تھا۔

”پروامت کرو۔ اب میں اچھی طرح نپٹ لوں گا۔“ میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”اب اندھیرے سے کوئی تیر میری طرف نہیں آئے گا۔“

کھانا کھا چکنے کے بعد میری تجویز پر رقص گاہ کا رخ کیا گیا۔ سلویا میرے ساتھ رقص کرتی رہی۔ بلونت نے ایک امریکی لڑکی کو ہم رقص بنالیا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ جب ہم رقص گاہ سے نکلے اور اپنے اپنے کیمپوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ رات میرے لیے ایک سنسنی خیز رات تھی۔ میں اپنے کیمپ میں بستر پر لیٹا ہوا خیالات میں مستغرق تھا۔ یہ ادراک خاصا ہیجان خیز تھا کہ میرا دشمن جانی مجھ سے بہت قریب ہے۔ میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس وقت کیشپ کے خیالات کیا ہوں گے۔ مجھے دیکھنے کے بعد اس پر کیا بیت گئی ہوگی۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔

کافی رات گزر گئی لیکن میں جاگتا رہا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جہاز پر اب سکوت چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سمندر کی لہریں غالباً قطعی پرسکون ہوں گی۔ کیونکہ جہاز بڑی سبک روی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

دفعتاً کیمپ کے دروازے پر دستک ہوئی اور میں چونک کر بستر سے اٹھ بیٹھا پھر دوسرے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ وہ سلویا



ہوگی لیکن اس سے اگلے پل میں مجھے ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔

”دروازہ کھولو! میں ہوں..... ششما۔“

ششما کی آواز سن کر میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے میں بستر سے آکر دروازے کی طرف جھپٹا تھا لیکن دروازے تک پہنچتے ہی مجھے جیسے ہوش آگیا۔ مجھے پوری طرح چوکنار ہونے کی ضرورت تھی میں ایک دم مڑ کر اسٹینڈ تک گیا اور اس پر گاؤن اتار کر پہننے لگا۔ پھر میں نے تکیے کے نیچے سے وہ بھرا ہوا ریوالور بھی نکال لیا جو مجھے سلویا نے فراہم کیا تھا۔ اسے میں نے گاؤن کی جیب میں اس طرح چھپا لیا تھا کہ جیب میں میرا ہاتھ اس کے دستے پر گرفت قائم کیے ہوئے تھا۔ اس تیاری کے بعد میں پھر دروازے کی طرف بڑھا جس پر اس دوران میں کئی دستکیں دی جا چکی تھیں۔

میں نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور شاید ششما سے ٹکرا جاتا جو آندھی طوفان کی طرح اندر آئی تھی۔ پھر اس نے خود ہی جلدی سے دروازہ بند کیا۔ اور مڑ کر میری طرف آئی۔ وہ بھی شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا وہ میری گردن میں دونوں ہاتھ ڈال کر جھول گئی اور بڑے جذباتی انداز میں بولی۔

”آخر تم ایک بار پھر مل ہی گئے۔ آہ..... تم نے مجھ پر ایک ہی ملاقات میں کیا جادو کر دیا تھا۔ ارسلان..... میں تمہیں بھول نہیں سکی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تم سے پھر ملاقات ہو سکے گی۔“

جیب میں ریوالور پر میری گرفت ختم ہو گئی اور ہاتھ جیب سے نکل کر ششما کی پیٹھ پر پہنچ گیا۔ اس کے بدن کا گداز اور وحشیانہ سا جوش و خروش میرے جذبات کو لیکھت بھڑکا چکا تھا یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے کسی نے بارود کے ڈھیر پر چنگاری پھینک دی ہو۔

”میں تمہیں ڈانٹنگ ہال میں دیکھتے ہی بے چین ہو گئی تھی۔ اب تک وقت بڑی مشکل سے کاٹا ہے میں نے بس پاپا کے سوتے ہی ادھر نکل آئی ہوں میں نے ایک اسٹیوارڈ سے معلوم کر لیا تھا کہ مسٹر ارسلان کس کیبن میں مقیم ہیں۔“

میرے تصور میں ایک خوابناک سانسوانی چہرہ ابھر آیا وہی چہرہ جو میرے جذبات کو مہمیز کرتا تھا لیکن آج میں نے اس چہرے میں ایک عجیب سی بات محسوس کی ہمیشہ وہ چہرہ مجھے مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ لیکن آج اس دلکش چہرے پر مسکراہٹ کے بجائے اضطراب و پریشانی کی گھٹاسی چھائی ہوئی تھی۔ آج وہ چہرہ کچھ اداس معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اداسی نے اس چہرے کی دلکشی کچھ اور سوا کر دی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ چہرہ حسب معمول میرے تصور کے پردے سے غائب ہو گیا۔ لیکن میرے جذبات اب پوری طرح بے ساختہ ہو چکے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ کب اور کس طرح میرے ہونٹ ششما کے ہونٹوں پر قابض ہو گئے تھے۔

رنگوں کی برسات ہونے لگی۔ میرے جسم میں پارہ جیسے کھٹکھٹانے لگا۔ میں نے ششما کو اپنی گود میں اٹھالیا۔ کیبن کے سکوت میں اب صرف تنفس کی دھیمی دھیمی سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس دھیمی دھیمی سی لذت آمیز گونج میں مجھے اپنے جذبات



چنختے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور ششما کا بدن گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا تھا۔ وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ اس پسینے میں اس کے بدن کی خوشبوئیں مہک رہی تھی۔ وہ خوشبوئیں جو انسانی زندگی کے ان لمحات میں گویا حاصل زندگی بن جاتی ہیں۔

خود فراموشی کے ان لمحات کو ثبات نہیں ہوتا، سوان لمحات کے ساتھ بھی ہوا۔ میرے اور ششما کے ساتھ وہ لمحات بھی بکھر گئے۔ میں بستر پر پڑا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ اور ششما کا سر میرے دائیں بازو پر رکھا ہوا تھا۔ کوئی تین چار منٹ بعد میں نے آنکھیں کھولیں اور آہستگی سے سر گھما کر ششما کی طرف دیکھا۔ دیکھا اور چونک پڑا۔ نہ صرف چونکا بلکہ بوکھلا کر اُٹھ بیٹھا۔

ششما..... ششما!“ میں اسے پکارنے لگا۔

ششما کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ اس طرح بار بار کھل کر بند ہو رہے تھے جیسے سانس اکڑ رہی ہو۔ چہرہ نیلا ہٹ کی طرف مائل تھا۔ جب میں نے اس کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا تو اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔

”ششما! کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ کیا ہو گیا؟“

”میں..... میں مر رہی ہوں..... ارسلان! میں پاپا کی دی ہوئی سزا پوری..... کر رہی ہوں.....“

”کیا!“ میں تقریباً چیخ پڑا۔ ”کیسے! یہ کیسے ممکن ہے؟“

”مقدس بابا کے ارشاد کے مطابق..... ان کے دیے ہوئے زہر سے..... ان کی خوشنودی کی خاطر۔ ششما آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی مجھے تمہاری ہی وجہ سے سزا ملی ہے..... اس رات میں تم کو..... اوپری منزل کے اس کمرے میں..... لے گئی تھی نا؟..... مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی تھی۔ مقدس بابا نے مجھے معاف نہیں کیا تھا..... انہوں نے کہا تھا کہ وقت آنے پر وہ مجھے سزا ضرور دیں گے..... اور آج وہ وقت..... آ ہی گیا..... انہوں نے پاپا کو حکم دیا کہ وہ مجھے زہر دے دیں..... ایک عجیب و غریب زہر..... اس زہر کے بارے میں مقدس بابا کے سوا کوئی نہیں جانتا..... وہ زہر میرے جسم پر مل دیا گیا تھا۔“

”جسم پر؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔ ایسا کرنا کیا ضروری تھا۔؟

”اس لیے کہ جو میرے قریب آئے وہ بھی موت کی آغوش میں آجائے۔ میرے جسم سے نکلنے والا پسینہ تمہارے مساموں کے ذریعہ تم کو بھی موت کے قریب پہنچا چکا ہے۔ اب اپنی فکر کرو ارسلان! میں تو مر رہی ہوں۔ تم شاید کسی طرح خود کو بچانے میں کامیاب ہو جاؤ۔“

ششما بہت آہستہ آہستہ اور بہت رک رک کر بول رہی تھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آواز بہت دور سے کسی کنوئیں کی گہرائی سے ابھر رہی ہو۔ میں نے سسکنے کے عالم میں یہ اطلاع سنی تھی کہ زہر میرے جسم میں بھی داخل ہو چکا ہے۔

ششما کے چہرے پر پھیلی ہوئی نیلا ہٹ اب کافی گہری ہو چکی تھی۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں بولی۔ ”میرے محبوب! تم ضرور سوچو گے کہ میں نے تمہاری موت کا ذریعہ بننا کیوں پسند کر لیا۔ تو سنو..... اگر میں ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوتی تو وہ زہر میرے



جسم پر زبردستی مل دیا جاتا۔ اور میں بے ہوشی کی حالت میں تمہارے کیبن تک پہنچا دی جاتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوئی اور طریقہ اختیار کرتے..... لیکن یہ بات طے ہے..... کہ..... نتیجہ وہی نکلتا جواب نکلا ہے۔“ ششما کی آواز بہت مدھم پڑ گئی تھی۔ ”جو شخص مقدس بابا کی نظروں میں معتب ہو جاتا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت موت سے نہیں بچا سکتی..... اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لوں۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے تبھی سے میری یہ خواہش تھی کہ مجھے تمہاری قرب حاصل ہو جائے۔ میں کچھ دیر کے لیے تمہاری آغوش میں سمٹ جاؤں۔“ ششما نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا چہرہ بالکل نیلا ہو چکا تھا۔

”ششما..... ششما.....“ میں نے بوکھلا کر اسے پکارا۔ ”کیا واقعی مجھ پر بھی زہر کا اثر ہو گیا ہوگا؟“

ششما نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز نہیں نکل سکی۔ اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اسے ایک ہنسی آئی جس کے بعد اس کی نبضیں ڈوب گئیں اور دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔

اپالو نے ایک اور بھیٹ لے لی تھی۔

اچانک مجھے اپنی طبیعت گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شاید زہر نے کام کرنا شروع کر دیا تھا..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ ششما کی باتوں کا نفسیاتی اثر پڑ رہا ہو۔ بہر حال میں گھبرائے ہوئے انداز میں کیبن کے دروازے کی طرف لپکا۔ میں جلد اجلد سلویا اور بلونت تک پہنچنا چاہتا تھا کہ انہیں اس صورت حال سے آگاہ کر دوں۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلا تو میرے قدم ڈگمگا رہے تھے اور دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ سلویا کی بہ نسبت بلونت کا کیبن زیادہ قریب تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا دروازہ پیٹ ڈالنا چاہا مگر ہاتھوں کی پہلی ہی ضرب سے دروازہ کھل گیا تھا۔ اندر سے کنڈی لگی ہوئی نہیں تھی۔

”بلونت..... بلونت!“ میں اسے پکارتا ہوا بے تحاشا اندر داخل ہو گیا۔ لیکن کیبن میں جو منظر دکھائی دیا تھا اس نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔

بلونت کے بستر پر سلویا بھی موجود تھی۔ وہ دونوں برہنہ تھے۔ اور دونوں کے سینوں میں خنجر پیوست تھے۔ خون سے سارا بستر سرخ ہو چکا تھا۔ ان دونوں کو دم توڑے ہوئے شاید خاصی دیر ہو چکی تھی۔

اف میرے خدا۔ کیا میرے جلو میں تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا؟

سلویا اور بلونت کی موت اس طرح ہوئی تھی کہ میرے دل سے درد کی لہریں پھوٹنے لگی تھیں اور میں اس کے سوا کچھ نہیں سوچ سکا تھا کہ ان کی موت میں کیشپ ہی کا ہاتھ ہوگا۔ منحوس کیشپ میرے ساتھیوں پر بھی وار کر بیٹھا تھا۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ٹانگوں کی ساری جان نکل گئی ہو۔ میں ایک دم بیٹھتا چلا گیا اور پھر فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا معلوم ہونے لگا تھا۔ سارے مسام پسینہ اگل رہے تھے۔ میں نے چیخا چاہا مگر آواز نہیں



نکل سکی۔ زہرا اپنی تمام تر ہلاکت آمیز یوں کے ساتھ میرے جسم کے ریشے ریشے پر قابض ہو چکا تھا۔

اچانک کیبن کا دروازہ کھلا اور کئی افسرانہ رگھتے چلے آئے۔ ان میں جہاز کے کپتان کا نائب بھی تھا۔ کیبن کا منظر دیکھ کر وہ سب دم بخود رہ گئے۔ ادھر میری یہ حالت تھی کہ اپنے جسم کے کسی بھی حصے کو معمولی سی بھی حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ حتیٰ کہ آنکھیں بھی پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ میری بینائی زائل نہیں ہوئی تھی میں دیکھ سکتا تھا۔

آنے والوں میں سے ایک شخص مجھ پر جھک گیا۔ اس نے اپنا ایک کان میرے سینے سے لگا دیا۔ پھر نبض دیکھی اور اس کے بعد مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر کپتان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ مر چکا ہے۔“

میرا ذہن الجھ گیا۔

کیا واقعی یہ موت تھی؟ مگر یہ کیسی موت تھی؟ میں دیکھ سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا، سن سکتا تھا، سوچ سکتا تھا، بس صرف حرکت ہی تو نہیں کر سکتا تھا۔ تو کیا حرکت نہ کرنے ہی کا نام موت ہے۔؟“

میں نے بہت سے مردے دیکھے تھے جن میں کوئی حرکت نہیں ہوتی مگر شاید وہ بھی میری طرح سب کچھ محسوس کر سکتے ہوں۔

یہ ماننے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ یہ کیفیت موت ہی کی کیفیت تھی۔

میں مر چکا تھا۔ اپا لو ختم ہو گیا تھا۔  
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk  
تباہی و بربادی کا دیوتا آج خود فنا ہو گیا تھا۔

(اس دلچسپ کہانی کا بقیہ حصہ آئندہ ہفتے کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا)

## خوفناک جنگل

دلیر مجرم کی بے پناہ پذیرائی کے بعد پیش خدمت ہے ابن صفی کی جاسوسی دنیا سیریز کا دوسرا ناول..... **خوفناک جنگل**۔ ایک پراسرار اور خوفناک جنگل جہاں عجیب و غریب واقعات ہوتے تھے اور لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بھوتوں کی کارگزاری ہے۔ حمید اور فریدی کس طرح اس راز سے پردہ اٹھاتے ہیں، معلوم کرنے کے لیے پڑھیے **خوفناک جنگل**۔